طلوعِ اسلام

دسمبر ۱۹۵۰

-/8/-

نظامِ پاکستان کے متعلق

علامہ اقبالؒ کا خط، قائدِ اعظم مرحوم کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انھوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انھوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اسوقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت، اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے پیچھے ہی پیچھے جارہا ہے . . . . اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اسوقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما (Development) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندو مت نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کیلئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّبہ	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۳ — دسمبر ۱۹۵۰ء — نمبر ۱۲

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
نظام پاکستان سے متعلق علامہ اقبال کا ایک خط	
لمعات	۳ - ۱۲
اسلام نے دنیا کو کیا دیا (نور الباقر صاحب)	۱۳ - ۱۶
حقیقت حدیث (علامہ اسلم جیراجپوری صاحب)	۱۷ - ۳۱
قرآن کا مصرف	۳۲ - ۴۲
باب المراسلات	۴۲ - ۴۸
۱- قرآن کریم کی حفاظت	
۲- حرمتِ شراب	
دستور پاکستان	۴۹ - ۵۵
جمہوریت - (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۵۶
ملک خداداد کا تصور	۵۷ - ۶۰
بیماری اور اس کا علاج	۶۱ - ۶۹
حقائق و عبر	۷۰ - ۷۵
اشتہارات	۷۶ - ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کہتے ہیں کہ جس بھیڑیے کے منہ کو انسان کا خون لگ جائے، پھر اسے کسی اور جانور کے خون میں لذت ہی نہیں ملتی۔ بھیڑیوں کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کے منہ کو انسان کا خون لگ جائے تو وہ چھڑائے نہیں چھوٹتا۔ آپ غور کیجئے تو انسان کی ساری تاریخ اسی خون کی لذت کی داستان نظر آئے گی۔ بالادست انسانوں نے ہمیشہ کمزور انسانوں کا خون چوسا اور ایسا انتظام رکھا کہ یہ انسان اُن کے پنجۂ فولادی کی گرفت سے نکلنے نہ پائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ فولادی پنجے انسان کے دونوں ہاتھوں میں رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ملوکیت (مالکانہ مفاد۔ یعنی Vested interests) کا پنجہ اور دوسرے ہاتھ میں مذہبی پیشوائیت (Priesthood) کا پنجہ۔ جس طرح شکار کی گرفت کے لئے انسان کے دونوں ہاتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح عوام کو اپنے استبداد کی گرفت میں رکھنے کیلئے ملوکیت اور پیشوائیت کے یہ فولادی پنجے بھی ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے ہیں۔ معاون و مددگار ہی نہیں، بلکہ یہ دو قوت حافظِ یکدیگراند۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی محافظ رہی ہے۔ اور مذہبی پیشوائیت، ملوکیت کی "رکھشا" (حفاظت) میں سپر بنی رہی ہے۔ آج بھی آپ دیکھئے۔ دنیا میں جہاں جہاں ملوکیت ہے، مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ ہے اور جہاں سے ملوکیت اٹھ گئی ہے، مذہبی پیشوائیت کا اقتدار بھی ختم ہو گیا ہے۔

مظلوم انسانوں کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کیلئے دنیا میں بہت سے تجربے ہوئے۔ ان میں آخری تجربہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر، سرزمین عرب میں ہوا۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ نوعِ انسانی کے اس عظیم القدر معلم و محسنؐ نے تیئس سال کی شبانہ روز محنت سے تاریخ میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو علی الاعلان کہہ دیا کہ دیکھ لو

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس انقلاب نے ہر قسم کے مالکانہ مفاد (Vested interests) اور مذہبی پیشوائیت (Priesthood) کا خاتمہ کر دیا جس سے انسانیت کو آزادی کی فضائے بسیط میں پرواز بال کشائی مل گیا۔ اس معلم و محسنِ انسانیتؐ نے اپنے اس تجربہ کو کسی راز میں نہ رکھا بلکہ ہر ایک سے کہہ دیا کہ اس تجربہ کے تمام اصول اس کتاب میں محفوظ ہیں جو میں تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں۔ ان اصولوں پر کاربند رہو گے تو ان کی رو سے پیدا شدہ انقلاب آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد مفاد پرستانہ ذہنیتیں پھر سے اپنی کمین گاہوں سے نکلیں اور انہوں نے اپنے گم گشتہ اقتدار کی بازیابی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ملوکیت کے قیام کیلئے مذہبی پیشوائیت کی تائید و اعانت ناگزیر ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی راہ میں، وہ کتاب جس میں اُس انقلابی تجربہ کے اصول منضبط تھے، سنگ گراں بن کر حائل ہو رہی تھی۔ لہٰذا ان دونوں قوتوں کی پہلی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کتاب کو راستہ سے ہٹانا چاہئے۔ انہوں نے اس کیلئے کیا کچھ کیا، یہ داستان بڑی طویل ہے۔ لیکن آخر الامر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور اس کتاب انقلاب کی عملی حیثیت یکسر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استحکام کے لئے سندیں وضع کرنی شروع کیں، چنانچہ ایک طرف اعلان کر دیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے) اور دوسری طرف اس قسم کے اعلانات کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں) اور ملوکیت اور پیشوائیت کی ان سندات کو منسوب کر دیا اس انقلاب آفریں معلم و محسنِ انسانیت کی طرف جس نے ملوکیت اور پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ چنانچہ

اس کے بعد مظلوم انسانیت پھر سے جسمانی اور ذہنی استبداد کے ان فولادی پنجوں کی گرفت میں آگئی اور ان کے فشارِ قاہرہ نے جی بھر کر اُن کا خون پیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے[1]۔ آپ دیکھئے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کے ممالک میں بادشاہتیں قائم ہیں اور ان بادشاہتوں کی تائید مُلّا کی زبان سے ہوتی ہے۔ وہ خطبوں میں خدا اور رسول کے ساتھ ان بادشاہوں کا نام پکارتا ہے اور ان کے پنجۂ استبداد کے استحکام و تقویت کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔ وہ زمینداریوں اور جاگیرداریوں کے جواز کے فتوے دیتا ہے اور ہر قسم کی مفاد پرستانہ ذہنیت کی تائید کرتا ہے۔ اسلام کے دورِ انقلاب میں امیر اس صاحبِ امر (صاحب اختیار) کو کہتے تھے جو خدا کے قانون کے زور پر مفاد پرستی کے بت کو توڑ دے۔ لیکن اب امیر اسے کہتے ہیں جو دولت مند ہو۔ مذہبی پیشوائیت، بادشاہ سے نیچے اتر کر انہی امرا کے سائے تلے پرورش پاتی ہے اور ان کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ آج مسلمانوں کے قریب قریب تمام ملکوں میں یہی حالت ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ انگریز کی حکومت قائم تھی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے وہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ ہندو چاہتا تھا کہ حکومت کو انگریزوں سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس طرح وہاں کے مسلمانوں پر حکمران بن کر بیٹھ جائے۔ اللہ کے ایک بندے نے اپنی قرآنی بصیرت سے اس صورتِ حالات کو بھانپ لیا اور مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنے کا تصور دیا۔ ایک دوسرا مردِ دانا اٹھا اور اس نے اس تصور کو حقیقت بنانے کیلئے جدوجہد شروع کر دی۔ مولوی ذہنیت[2] نے ان حالات کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے اقتدار کا امکان اسی شکل میں ہو سکتا ہے کہ

(۱) یا تو مسلمانوں کی حکومت اس انداز کی قائم ہو جس میں قانون کے اختیارات اُس کے ہاتھ میں ہوں (اس کا نام اس نے قانونِ شریعت کا نفاذ رکھ چھوڑا تھا کیونکہ شریعت کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا اور یہی اس نے سب کو بتا رکھا تھا)۔

(۲) اور اگر اس قسم کی حکومت قائم نہ ہو تو پھر اس کے اقتدار کی دوسری صورت یہ تھی کہ ہندوؤں کی لادینی اسٹیٹ ہو جس میں مسلمانوں کے پرسنل لاء کا تحفظ ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس پرسنل لاء (شریعت) کی نگرانی مولوی صاحبان کے سپرد ہی کی جا سکتی تھی۔

مولویانہ ذہنیت نے دیکھا کہ اول الذکر صورت کا امکان بعید ہے کیونکہ تحریک پاکستان کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں تھی ان سے اسے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ قانونی اختیارات مولوی صاحبان کے ہاتھوں میں دیدیں گے۔ بالفاظِ دیگر مولوی کو مسٹر جناح سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی مملکت کو مولویت کی مفاد پرستانہ ذہنیت کے سپرد کر دیں گے اس لئے کہ مسٹر جناح کی نگاہ تاریخ پر تھی اور تاریخ بتا رہی تھی کہ یہ ذہنیت کن کن تباہ کاریوں کا موجب بنتی رہی ہے۔ لہٰذا مولوی نے اپنا مفاد دوسری شکل میں دیکھا اور تحریک پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ تھا قومیت پرست علماء کا مسلک۔ مولوی کا ایک گروہ تھا جو اس طبقہ سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے سوچا کہ انداز یہ رکھنا چاہئے کہ اگر پاکستان کی تحریک کامیاب نہ ہو تو مشترکہ ہندوستان میں ان کا گروہ مذہب کا نمائندہ سمجھا جائے اور اگر پاکستان قائم ہو جائے تو وہاں قانونِ شریعت کے نفاذ کی تحریک سے اپنا اقتدار قائم کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس گروہ نے ایک طرف قومیت پرست علماء کی مخالفت شروع کر دی (تاکہ پاکستان بن جانے کی صورت میں ان کا شمار قومیت پرستوں میں نہ کیا جائے) اور دوسری طرف پاکستان کی بھی مخالفت شروع کر دی (تاکہ پاکستان نہ بننے کی صورت میں انھیں حامیانِ پاکستان نہ قرار دیا جائے) اور اس کے ساتھ قانونِ شریعت کی پکار شروع کر دی (تاکہ پاکستان بنے تو اور نہ بنے تو ان کے وقار و اقتدار کی صورت بہرحال نکل آئے۔ شریعت سے ان کا مقصود تھا وہ قانون جسے یہ لوگ مرتب کریں اور مرتب کرنے کے بعد اُس کی تعبیر (Interpretation) بھی

---

[1] ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مسلمانوں کی تاریخ پر عمومی تبصرہ ہے۔ مستثنیات ان میں داخل نہیں کیونکہ تاریخ عمومیت سے مرتب ہوتی ہے مستثنیات سے نہیں۔

[2] ہم ذہنیت کا ذکر کر رہے ہیں افراد کا نہیں۔ بہت سے مولوی صاحبان نے پاکستان کے نظریہ کی تائید بھی کی تھی۔

انہی سے پوچھی جایا کرے۔ یعنی قانون کے اجارہ دار یہ ہوں اور حکومت ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشنری ہو۔ یہ گروہ اسلامی جماعت کے نام سے متعارف ہوا۔ پاکستان بن گیا۔ قومیت پرست علماء ہندوستان میں رہ گئے اور اسلامی جماعت کے مولوی صاحبان پاکستان آ گئے اور یہاں "شریعت" کے نفاذ کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ شریعت وہ ہے جسے یہ شریعت کہیں۔ ان کی یہ شریعت وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس کی خصوصیتِ کبریٰ مالکانہ مفاد (Vested interests) کی موافقت اور حفاظت ہے۔ پاکستان میں بادشاہت کے قیام کی تو صورت نہیں۔ اس لئے یہاں مالکانہ مفاد کی صورت زمینداری، جاگیرداری، سرمایہ داری ہے۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ ان مفادات کے تحفظ اور ان کی تائید سے پیشوائیت کے اقتدار کا استحکام ہو جائے۔ یعنی استبداد کے وہی فولادی پنجے جنہیں قرآن کے انقلاب آفریں نظام نے توڑا تھا، انہیں پھر سے مسلط کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سامنے جب قرآن کا نام لیا جائے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے کہ قرآن پیشوائیت اور مفاد پرستانہ ذہنیت دونوں کا دشمن ہے۔ عہدِ رسالتمآبؐ میں کبھی کسی نے مولوی کا نام ہی نہیں سنا تھا۔ آپ نے کہیں یہ نہ پڑھا ہو گا کہ کسی نے حضرت مولانا ابوبکر صدیقؓ یا مولانا عمر فاروقؓ کہا ہو۔ وہ دور اس چیز سے آشنا ہی نہ تھا۔ یہ سب دورِ ملوکیت کی پیدا شدہ چیزیں ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ اسی اسلام کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے لیکن اس کی نسبت کر دی جاتی ہے حضور رسالتمآبؐ کی طرف۔ نبی اکرمؐ نے قرآن ہی کی اتباع فرمائی۔ اسی کے ذریعے وہ انقلاب پیدا کیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ نے قرآن ہی سے اسلامی مملکت کا نظام و آئین مرتب فرمایا۔ اس لئے قرآن سے آئین مرتب کرنا عین سنتِ رسول اللہؐ کے مطابق ہے۔ لیکن اس میں پیشوائیت کو نہ اپنے اقتدار کے جواز کی سند ملتی ہے نہ اس مالکانہ مفاد کے تحفظ کی گنجائش جن کی یہ تائید کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ سنتِ رسول اللہؐ نام ہے اُن روایات کا جن میں ان سب باتوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے جس سے انہیں بھی انکار نہیں کہ رسول اللہؐ نے روایات کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ حضورؐ نے خود بھی قرآن پر عمل کیا اور امت کو بھی اسی پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ روایات کے مجموعے تیسری صدی میں مرتب ہوئے جو مسلمانوں کی ملوکیت کا دور ہے۔ اور ان مجموعوں میں وہ تمام روایات درج ہو گئیں جن سے ملوکیت اور پیشوائیت کو تقویت ملتی تھی اور جو اس مقصد کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ اب یہ لوگ ان روایات کو سنتِ رسول اللہؐ کا مقدس نام دے کر ان کے ذریعے اپنے اقتدار کا تسلط چاہتے ہیں۔

علاوہ ازیں ایک بات اور بھی ہے۔ قرآن کا اپنے متعلق دعوے ہے کہ اس میں کہیں تضاد نہیں۔ اس کی تعلیم کھلی، کھلی، واضح اور غیر مبہم ہے اور اختلاف کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس کے برعکس، روایات لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور جس قسم کا حکم آپ چاہیں ان سے نکل سکتا ہے۔ جو روایات آپ کے مطلب کی ہوں، انہیں صحیح کہہ دیجئے۔ جو اس کے خلاف ہوں، انہیں ضعیف قرار دے دیجئے۔ کہنے کو تو صحیح اور ضعیف کے کئی معیار مقرر ہیں لیکن عملاً اس کا فیصلہ پیشوائیت کی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے۔ چنانچہ ان معیاروں پر بحث کرنے کے بعد جو احادیث کے پرکھنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ارشاد فرماتے ہیں:

> محدثین رح کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہیں تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے۔ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس

حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت
تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا .....
پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ تحقیقات بھی
انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد۔ دوسرے بلحاظ تفقہ۔

(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۱۹۰-۱۸۰)

یہاں تک آپ دیکھیں گے کہ روایات کے متعلق یہ وہی نظریہ ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ جب احادیث کی حالت یہ ہے تو دین کے متعلق یقینی تعلیم کا سرچشمہ قرآن کریم ہی رہ جاتا ہے کیونکہ اس کی صحت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یعنی طلوع اسلام خدا کے قانون کی اتباع کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے برعکس، مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جب احادیث کی حالت یہ ہے کہ ان کے پرکھنے کے ذرائع ناقص ہیں، تو پھر رسول اللہ کا صحیح حکم معلوم کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں

> کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہؐ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۱۸)

غور کیجئے کہ مودودی صاحب آپ کو کس قیام پر لے جاتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

(۱) پاکستان میں قانونِ شریعت کا نفاذ ہونا چاہیے۔

(۲) قانونِ شریعت احادیث کی رو سے مرتب ہوگا۔

(۳) احادیث کا ذخیرہ ضعیف اور قوی، صحیح اور موضوع روایتوں پر مشتمل ہے۔

(۴) انہیں پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو جائے وہ جسے صحیح کہدے وہ صحیح ہے جسے غلط کہدے غلط ہے۔

(۵) اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت خود مودودی صاحب سے بڑھ کر رسول اللہؐ کا مزاج شناس اور کون ہو سکتا ہے۔

لہذا — (۶) قانونِ شریعت وہ ہوگا جسے مودودی صاحب قانونِ شریعت قرار دیں۔

یہ چیز محض قیاسی نہیں واقعات پر مبنی ہے۔ اگلے دنوں مودودی صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی کہ زمین پر انفرادی ملکیت جائز ہے اور ایک شخص اپنی زمین دوسروں کو بٹائی پر کاشت کے لئے دے سکتا ہے۔ بعض حضرات نے ان کے اس مسلک کے خلاف کچھ احادیث پیش کیں جن میں مذکور تھا کہ رسول اللہؐ نے زمین کو بٹائی پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ احادیث پرکھنے کے اصولوں کے مطابق یہ روایات صحیح قرار پائی تھیں۔ لیکن مودودی صاحب نے فرمایا کہ نہیں! حدیثیں وہی صحیح ہیں جو میرے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ یہ حدیثیں جو اس مسلک کے خلاف جاتی ہیں ان کے متعلق میری ممارست مجھے یہ بتاتی ہے کہ

> دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔　　(ملکیتِ زمین)

اس "دراصل" کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ یعنی ان احادیث کے الفاظ تو بیشک مودودی صاحب کے مسلک کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن دراصل ہوا یہ کہ رسول اللہؐ نے کچھ اور فرمایا تھا اور روایات میں کسی اور طرح بیان ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ

مودودی صاحب کے پاس وہ کونسا ذریعہ علم ہے جس کی بنا پر انہوں نے یہ معلوم کرلیا کہ درحقیقت رسول اللہؐ نے کچھ اور فرمایا تھا اور روایات میں بیان کسی اور طرح ہوگیا۔ یہ ذریعہ علم ہے رسول اللہؐ کی وہ "مزاج شناسی" جو کثرت مطالعہ اور مہارست سے مودودی صاحب کو حاصل ہوگئی ہے اور جس کے پیش نظر وہ تمام مستند محدثین کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ

روایت کے بارے میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت، اور فہم واستنباط سے ہے، ان میں بھی وہ بالکلیہ معتمد سمجھے جائیں۔ (ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۵ صفحہ ۲۸۹)

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مودودی صاحب کس طرح قانون شریعت کے متعلق خود آخری سند (Final Authority) کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ شریعت کے معاملہ میں آخری سند خدا کی کتاب ہے۔ اس لئے کہ ایسا کہنے میں ان کی اپنی سیادت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ وہ اس کے برعکس کہتے یہ ہیں کہ

جس حکومت کے دستور میں رسول خداؐ کے حکم کو آخری فیصلہ کن سند نہ تسلیم کیا گیا ہو وہ ایک اسلامی حکومت نہیں ہے۔ (دستوری سفارشات پر تنقید صفحہ ۱۱)

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں اس ٹکڑے کو پڑھئے۔ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے "آخری حکم رسول اللہؐ کا ہے" اور "رسول اللہؐ کا صحیح حکم وہ ہے جسے میں صحیح قرار دوں" لہذا "آخری حکم میرا فیصلہ ہے"۔ دیکھا آپ نے کہ پیشوائیت کی ہوس اقتدار کس مقدس اور معصوم رنگ میں آگے بڑھتی ہے۔ یہ عوام کی نگاہوں میں عاشق رسول اللہؐ قرار پاتے ہیں۔ سنت کے تبع، حضورؐ کے فرامین کے دلدادہ۔ انہی کے مطابق آئین پاکستان مرتب کرنے کے داعی۔ اس سے زیادہ ان کے پیش نظر اور کوئی غرض نہیں۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو خالص اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کے عزائم۔ غور کیا آپ نے کہ کس بری طرح سے حضور سرور کائناتؐ کے نام کو (Exploit) کیا جارہا ہے اور کس معصومانہ انداز میں پیشوائیت کی حکومت (Theocracy) قائم کرنے کے منصوبے باندھے جارہے ہیں۔ ہمارے بعض سطح بین احباب شکایت کیا کرتے ہیں کہ طلوع اسلام کو کیا ہوگیا کہ یہ اس جماعت کی مخالفت کر رہا ہے جو شریعت کا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے؟ طلوع اسلام کو یہ ہوگیا ہے کہ یہ لوگ اپنی آمریت قائم کرنے کی فکر میں ہیں اور اس کے لئے خدا اور اس کے مقدس رسول کو سپر بنا رہے ہیں۔ وہ تاریخ میں دیکھ چکا ہے کہ پیشوائیت نے اس سے پہلے کون کون سے فتنے برپا کئے ہیں اور اس بھولی بھالی امت کو کس کس طرح فریب دیئے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہی پیشوائیت اب اس نازک ترین دور میں امت کو کتنا بڑا فریب دینے کے درپے ہے۔ ذرا سوچئے کہ طلوع اسلام کو اس مخالفت سے لینا کیا ہے؟ طلوع اسلام کی ساری تاریخ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ کیا اس تمام زمانہ میں آپ کوئی ادنیٰ سی مثال بھی ایسی پیش کرسکتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ طلوع اسلام نے کوئی بات اپنے مفاد کے لئے پیش کی ہو۔۔۔ طلوع اسلام کی کوئی پارٹی نہیں۔ یہ کسی پارٹی کا آرگن نہیں۔ کسی گروہ کا طرفدار نہیں۔ اس نے الکشن نہیں لڑنے، اس نے ووٹ نہیں حاصل کرنے۔ پھر اسے کیا پڑی ہے کہ کسی جماعت کی مخالفت خواہ مخواہ کرے۔ اگر کوئی پارٹی الیکشن جیت کر سب کی سب نشستیں بھی حاصل کرلے تو طلوع اسلام کو کیا۔ طلوع اسلام کے نزدیک موجودہ سب پارٹیاں برابر ہیں۔ اسے اس سے کیا دلچسپی ہے کہ کون آمد و کون رفت۔ لیکن طلوع اسلام کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ پیشوائیت کے عزائم قوم کو کس طرح تباہیوں کی طرف لئے جارہے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ مذہب کے مقدس نام پر ہورہا ہے اس لئے سادہ لوح قوم ان عزائم کو بے نقاب نہیں دیکھ رہی اور ان کے دھوکے میں آرہی ہے۔ طلوع اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قوم کو اس مہیب خطرہ سے آگاہ کردے۔ قوم دوسری پارٹیوں سے فریب نہیں کھاتی۔ جب بھی کوئی لیڈر لنگ پارٹی بناتا ہے تو ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ یہ اپنی وزارت قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ اور وہ خود بھی اس اعتراف سے ہچکچاتا نہیں۔ لیکن مولویوں کی

اس پارٹی کے متعلق سادہ لوح مسلمان ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہے کہ ان کا مقصود وزارتیں اور امارتیں نہیں۔ یہ تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے ان کا ساتھ دینا، خدا اور رسول کا ساتھ دینا ہے۔ پیشوائیت (Priesthood) نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ پیشوائیت آج بھی یہی کر رہی ہے۔ طلوعِ اسلام پیشوائیت کے چہرے سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھی قوم اگر ان کی اتباع میں بربادیوں کے جہنم کی طرف جانا چاہے تو اس کی مرضی۔ پیشوائیت طلوعِ اسلام کے کسی اعتراض کا جواب تو دے نہیں سکتی۔ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کہہ دیتی ہے کہ طلوعِ اسلام رسول اللہؐ کا منکر ہے! قاعدہ کی بات ہے کہ ہر شکست خوردہ گالیوں پر اتر آتا ہے۔ مولویت کی زبان میں یہ بھی گالی ہے۔ اگر اس سے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو وہ اور گالیاں دے لے۔ ورنہ کوئی ان سے پوچھے کہ جس طلوعِ اسلام کا ایمان یہ ہو کہ کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسالتِ محمدیہؐ پر ایمان نہ لائے۔ اور کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا اگر وہ رسول اللہؐ کے بعد کسی اور کو رسول تسلیم کرے۔ اُسے رسول اللہؐ کا منکر کہنا کتنا بڑا جھوٹ ہے! کہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام سنتِ رسول اللہؐ کا منکر ہے! طلوعِ اسلام کا ایمان یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن کی اتباع فرمائی لہٰذا قرآن کی اتباع ہی رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ رسول اللہؐ نے امت کو قرآن دیا، لہٰذا قرآن سے متمسک رہنا ہی رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل ہے۔ طلوعِ اسلام رسول اللہؐ کے لائے ہوئے دین کا منکر نہیں۔ وہ منکر ہے اس مذہب کا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں تیار ہوا اور جو غلط روایات کے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر منسوب کر دیا گیا جنابِ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ طلوعِ اسلام اس مذہب کا منکر ہے اس لئے کہ اس مذہب کی رو سے رسول اللہؐ کے دیئے ہوئے دین کی جڑ کٹتی ہے۔ پیشوائیت اسی مذہب کو سچا دین بتاتی ہے۔ اس لئے کہ اس مذہب میں ان کی اپنی سیادت و امارت کا راز مضمر ہے۔

ذرا سوچئے کہ آج ہم کس نازک دور میں پہنچ چکے ہیں؟

تیرہ سو سال کے بعد ہمیں پھر ایک خطۂ زمین ایسا نصیب ہوا ہے جس پر ابھی کوئی نظام مسلط نہیں ہوا۔ پھر سوچئے! تیرہ سو سال کے بعد یہ پہلا موقعہ آیا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ وہ اپنے لئے کس قسم کا نظام مرتب کرنا چاہتے ہیں! سوچئے کہ ہم تاریخ کے کس دوراہے پر کھڑے ہیں؟ ایک طرف وہ راستہ ہے جو ہمیں اس تجربہ کی طرف لے جاتا ہے جو محمد رسول اللہؐ کی وساطت سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عمل میں آیا جس نے دنیا کے سامنے خدائی نظام کو متشکل کر کے دکھا دیا۔ دوسری طرف وہ راہ ہے جو ہمیں اس نظام کی طرف لے جاتی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔ رجعت پسند قوتیں (Re-actionary Forces) پھر سے اُس نظام کو مسلط کرنے کی فکر میں ہیں جو ہمارے دورِ استبداد کی یادگار رہا ہے اور جو آج بھی مسلمانوں کے دوسرے ممالک میں رائج ہے۔ اگر یہ نظام رائج ہو گیا تو پاکستان بھی ویسا ہی ملک ہو جائے گا جیسے مسلمانوں کے دیگر ممالک مثلاً افغانستان، ایران، عراق، عرب ہیں۔ لیکن اگر یہاں قرآن کا نظام نافذ ہو گیا تو پاکستان نہ صرف خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جائے گا بلکہ پوری دنیا کی امامت اس کے حصہ میں آ جائے گی۔ آج دنیا، اپنے ہر نظام سے تنگ آ کر مڑ مڑ کر دیکھتی ہے کہ کوئی نظام ایسا بھی ہے جو انسانیت کو تباہی اور بربادی سے بچا لے۔ روس صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے، بایں ہمہ دنیا اللہ کر اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اگر آج دنیا کو کوئی ایسا نظام دیدے جو انسان کی روٹی کا مسئلہ بھی حل کر دے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے شرفِ انسانیت کو بھی بالیدگی عطا

کردے، تو ساری دنیا اس کی طرف جھک پڑے گی۔ اس لئے کہ روس کے پاس شرف انسانیت کی نشوونما کا کوئی سامان نہیں وہ شرف انسانیت کے الفاظ تک سے ناآشنا ہے۔ وہ انسان کو صرف حیوان کی سطح پر دیکھتا ہے۔ لیکن انسانی مشکلات کا حل دنیا کی جمہوریتوں کے پاس بھی تو نہیں ہے۔ وہ بھی تو انسان کو اس کی طبعی سطح (Physical Status) سے اونچا نہیں لے جاتیں۔ اس لئے اگر پاکستان نے تاریخ کے اس نازک موڑ پر صحیح راہ کی طرف قدم اٹھایا تو یہ نہ صرف ملت پاکستانیہ ہی کے لئے وجہ شادابی ہوگا بلکہ یہ ساری انسانیت پر احسان ہوگا۔ یاد رکھئے! خدا نے اپنے اس آخری ضابطہ کا وارث مسلمانوں کو بنایا تھا۔ اس نے انھیں امت وسطیٰ (International Party) قرار دیا تھا جس کا فریضہ یہ بتایا تھا کہ لیکونوا شھداء علی الناس۔ تاکہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھے۔ انھوں نے وارث کتاب ہونے کے باوجود اس فریضہ کی ادائیگی سے کوتاہی برتی اس لئے اس تیرہ سو سال میں تمام نوع انسانی سے جسقدر جرائم، انسانیت کے خلاف سرزد ہوتے ہیں، ان سب کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر عائد ہوتی ہے۔ اگر چوکیدار کی موجودگی میں چوری ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے چوکیدار پکڑا جاتا ہے۔ انہی جرائم کی سزا ہے جس میں یہ قوم اسوقت تک ماخوذ چلی آرہی ہے۔ جہاں اپنی حکومت نہیں وہاں غیروں کی غلامی اور جہاں اپنی حکومتیں ہیں وہاں ملوکیت اور پیشوائیت کا استبداد اس سے بڑھ کر اور سزا کیا ہو سکتی ہے؟ اب خدا خدا کر کے ایک موقعہ سامنے آیا ہے کہ اگر یہ قوم چاہے تو اپنے جرائم کا کفارہ ادا کر کے خود بھی سربلندی و سرفرازی کی زندگی بسر کرے اور نوع انسانی کو بھی سلامتی کے راستہ کی طرف لے جائے۔ لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو مسلمانان دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح، یہ بھی مغربی اقوام کے سیاسی مصالح کے رحم و کرم پر زندہ رہے گی۔ اس صورت میں یا تو کمیونزم کا لادینی فلسفہ اسے جھپٹ کر لے جائے گا اور یا یورپ کا دوسرا محاذ اسے اپنی کامجوئیوں کا آلۂ کار بنائے رکھے گا۔ پاکستان میں ملوکیت اور پیشوائیت کے ازمنہ وسطیٰ کے مستبد نظام کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا! ہم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے اب ہمارا روئے سخن دوسری طرف ہے

قرآن کو ابدی صداقتوں کا ضابطہ ماننے والو! یہ وقت تمہارے لئے سخت امتحان کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بے سروسامان ہو۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مالکانہ مفاد اور پیشوائیت بڑے سازوبراق کے ساتھ میدان میں اتر آئی ہے کہ کسی طرح قرآن آگے بڑھنے نہ پائے جیسا کہ قرآن نے پہلے ہی بتا رکھا ہے، اس گروہ نے وہی پرانا طریق اختیار کر لیا ہے کہ تم اس قدر شور مچاؤ کہ کوئی قرآن کی آواز سننے نہ پائے۔ ان کے پاس شور مچانے کا سامان بہت ہے۔ ارباب حکومت بھی شور سے متاثر ہو جاتے ہیں کہ یہی اس دور کا انداز ہے۔ اس نقارخانہ میں تمہارا دھیمے سروں کا نغمہ کون سن سکے گا! لیکن بایں ہمہ تم اپنی آواز کو اپنی وسعتوں کے مطابق بلند کرو۔ شاید قوم میں ایسی سعید روحیں بھی ہوں جو بعض اوقات بے صوت صداؤں سے بھی بیدار ہو جایا کرتی ہیں۔ حکومت نے خود مسلمانوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بتائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ تم اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اپنی جگہ قرار دادیں پاس کرو۔ لوگوں سے دستخط کراؤ۔ اخبارات میں بیانات شائع کراؤ۔ پریس کانفرنسیں منعقد کرو۔ اور ان سب میں یہ کہو کہ ہم طلوع اسلام کے اس مطالبہ سے متفق ہیں کہ پاکستان کا نظام قرآن کی بنیادوں پر مرتب ہونا چاہئے۔ طلوع اسلام کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ اس میں اس مجرد مسئلہ (Abstract Problem) کو محسوس شکل (Concrete form) میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ اس مطالبہ سے مقصد کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو طلوع اسلام کے پیش کردہ آئین کی بعض جزئیات سے اختلاف ہو تو آپ بیشک طلوع اسلام کا بھی حوالہ نہ دیں۔ فقط اتنا

کہدیں کہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظام قرآن کے اصولوں کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ آپ اپنا فرض ادا کر دیجئے۔ اس کے بعد اگر آپ کامیاب نہ بھی ہوئے تو بھی آپ کو اتنا اطمینان تو ہوگا کہ جب ہمارے سامنے ایک موقعہ آیا تھا تو ہم نے قرآن کی آواز کو بلند کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا۔[1]

باقی رہا طلوعِ اسلام، سو یہ خود اپنی بے مائیگی سے واقف ہے۔ محدود صفحات کا ایک ماہوار مجلہ، جس کے پیچھے کوئی پارٹی نہیں کوئی ادارہ نہیں۔ اس کے مقابل میں شور مچانے والوں کی ایک پوری دنیا۔ یہ اس کی تہی مائیگی اور وہ اس کے عزائم۔

خاک ناچیز کہ سازد آسمانے دیگرے   ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر![2]

بایں ہمہ نادانی و بیکسی، یہ سوت کی انٹی لیکر بازارِ مصر میں یوسف خریدنے نکل آیا ہے۔ لیکن اس کا حقیقی سرمایہ سوت کی انٹی نہیں بلکہ اس کی متاعِ قلبِ سوزاں، جگرِ بریاں اور چشمِ گریاں ہے جو بازارِ عشق و محبت میں ہزار گنج گراں مایہ سے گراں تر سمجھی جاتی ہے اور جو ہر استفہام ہنسی بننے والے کو تبسم زیرِ لبی سے کہدیتی ہے کہ

بدست و پا نیم کہ ہنوز از دو فورِ عشق   سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

سوت کی انٹی اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ہے اور نگاہیں اس چوکھٹ پر جہاں بیع و شریٰ کے انداز بالکل جداگانہ ہیں۔ یہ عجب کہ وہاں احساسِ بے مائیگی کے یہ قطراتِ انفعال، موتی سمجھ کر چن لئے جائیں۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

مکتوب گرامی جناب عرشی صاحب (لاہور)

مکرم مدیر طلوعِ اسلام۔ السلام علیکم۔ "طلوعِ اسلام" نومبر ۱۹۵۰ء پہنچا، پاکستان کانسٹی ٹیوشن پر سپیشل آرٹیکل اور لمعات کو ایک ہی فرصت میں بغور پڑھ ڈالا۔ یہ پرچہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ میں تمام ناظرینِ طلوعِ اسلام سے اپیل کروں گا کہ وہ محض اسے ایک مضمون سمجھ کر نہ پڑھیں کہ پڑھا اور ریشت فائل کر دیا۔ یہ طلوعِ اسلام کے روزِ اول سے آج تک کا آخری مقصد ہے یہی ہماری منزل ہے جس کی طرف بڑھنے کے لئے ہمیں حرکت کرنا ہے۔ اس سے دولتِ پاکستان، پوری مسلمان قوم اور پھر تمام کائنات انسانیت کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ اگر ہم اس وقت چوک گئے تو اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ اربابِ حکومت واقعی اسلام سے مایوس ہیں، وہ صرف عوام کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے "اسلام اسلام" پکارتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامنے اسلام نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ اختلافات اور فرقہ بندیوں کا انبارِ عظیم جس سے قیامت تک کوئی کام کی بات حاصل نہیں کی جا سکتی یقیناً اسلام کہلانے کا مستحق نہیں۔ بلکہ اسلام کے ماتھے پر ایک امٹ داغ ہے، جس کی پرستش جہلاء سے تو کرائی جا سکتی ہے، لیکن کوئی روشن دماغ

---

[1] ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ محترم عرشی صاحب کا ایک مکتوب گرامی موصول ہوا جسے ہم شائع کر رہے ہیں۔

[2] یہ شعر طلوعِ اسلام کے دورِ اول کے پہلے پرچے کی پیشانی پر ثبت تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی فیض گستری نے کس طرح اس خاک کے ذرۂ ناچیز سے ایک طوفان انگیز بیابان تعمیر کرا دیا۔

اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا —— آپ نے قرارداد مقاصد، بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کر کے ایک صالحانہ بحث کا دروازہ کھولا ہے، اس کے بعد "قرآنی قرارداد مقاصد" پیش کر کے تعمیر کی طرف نہایت مبارک قدم اٹھایا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ طلوع اسلام سالہا سال سے جن دماغوں کو تربیت کر رہا ہے ایک دم اٹھ کھڑے ہوں اور اس آواز کو ایوانِ حکومت تک پہنچا کر دم لیں۔ اس کے لئے عوام کی ہم نوائی ضروری ہے، اخبارات سے کام لینا پڑیگا۔ پریس کانفرنسوں کے ذریعے یا جو ذریعہ بھی کارگر ہو سکے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے آپ ہی کے قول کے مطابق آخری حرف نہیں۔ لیکن شور مچانے والوں سے آج تک اتنا بھی نہیں ہو سکا، عام طور پر ہوتا یہ رہا ہے کہ ایک طرف تو حکومت کی ہر آواز پر "آمین" کہہ دی جاتی ہے۔ یا ہر جزو کل پر تردید کی کلہاڑی چلا دی جاتی ہے، سنجیدگی سے یہ نہیں بتایا جاتا جو غلط ہے وہ کیوں غلط ہے اور اس کی بجائے صحیح کیا ہے۔ آپ نے ماشاء اللہ اس فرض کو بطریق احسن انجام دیا۔ جن خاص خاص باتوں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ ڈیموکریسی کے چہرے سے جس طرح آپ نے پردہ اٹھایا ہے، بہترین انکشاف حقیقت ہے۔ اس سے پرستارانِ مغرب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ عقلی تصریح کے ساتھ جہاں آپ نے قرآن سے استشہاد کیا ہے وہ مدعیانِ مذہب کیلئے بھی سرمۂ بصیرت ہو سکتا ہے۔

۲۔ مولوی کا مطلوبہ اسلامی نظام جس کی ہر ہر جزئی فقہا نے پہلے سے مرتب کر رکھی ہے، جس کے متعلق مولوی کا مطالبہ ہے کہ وہ سو بچاس قرآنوں سے بھی زیادہ وزنی چیز قیامت تک کیلئے مسلمانوں کی پیٹھ پر لاد دی جائے، موجودہ نسل کے سامنے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اکبر الہ آبادی قسم کا مسلمان شاعر تھا۔ ٹھیک کہہ گیا ہے:

یہ صندوقِ کتب اب مجھ سے یا رب اٹھ نہیں سکتا   یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

اس پر بھی آپ نے نہایت مناسب خامہ فرسائی کی ہے۔

۳ —— اسلامی آئیڈیالوجی کے دو لفظوں میں آپ نے وہ کچھ بتا دیا ہے جس کیلئے آج کی دنیا بے تاب ہو ہو کر کبھی اپنے آپ کو اور کبھی امید و بیم کی نظروں سے روس کی طرف دیکھتی ہے۔

۴ —— قرارداد مقاصد پر تنقید کرتے ہوئے جہاں آپ نے "قرآن و سنت" پر قلم اٹھایا ہے اور سنت کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال کا نظریہ پیش کیا ہے، اس کی راہ میں مولوی بہت سے لات و ہبل کھڑے کرے گا کہ قرآن کے استقلال کو صدمہ پہنچائے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ قرآن کا خدا مصنوعی خداؤں اور مصنوعی قرآنوں کا خاتمہ کر دے۔

۵ —— اسلامی دستور کے بنیادی اصول کی تین شقیں جو آپ نے متعین فرمائی ہیں، ان میں تیسری شق میں حدیث یا سنت اور فقہ کی نہایت صحیح پوزیشن آپ نے واضح کر دی۔ یعنی نہ تو ہم انہیں بالکل متروک و مہجور کریں گے اور نہ ہی قرآنی ابدیت میں شریک ٹھہرائیں گے۔

۶ —— بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے آپ نے "مسلمانوں پر قرآنی تعلیم کے وجوب" کی جو "ہو الشافی" اور "۷۸۶" سے تشبیہ دی ہے اور اس کو اصل رپورٹ سے بے تعلق اور محض برائے "ثواب" بتایا ہے، یہ بہت سے دلوں کی آواز ہے جو آپ کے منہ سے نکلی ہے۔

۷ — اوقات و مساجد کی تنظیم ملت کی رگِ جان کا مسئلہ ہے، جس کا صحیح احساس نہ عوام کو ہے اور نہ حکومت کو۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس کو "روشنی، جھاڑو، صفوں اور لوٹوں" میں منحصر کر لیا گیا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وقف میں "زندہ برست مردہ" ہو جاتا ہے، اس کی اصلاح و درستی کیلئے زبردست اقدام کی ضرورت ہوگی۔

۸ — رئیس مملکت (بقول وزیر اعظم) ایک غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی موسیٰ کی گدی پر فرعون کو بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔ اس ذہنیت نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ قرآن نے اس عہدے کے لئے "اتقیٰ" کی شرط لگائی ہے اور علم و جسم کی برتری کا مطالبہ کیا ہے، تعجب ہے کہ ہماری بنیادی اصولوں کی کمیٹی اس باب میں بالکل گنگ ہے۔

۹ — رئیس مملکت کو مواخذے سے بالاقرار دینا سراسر غیر اسلامی تصور ہے، پھر اس کو ایک "ون آرا" کے سامنے سربسجود ہونے کے لئے مجبور کرنا۔ تعجب پہ تعجب ہے۔

۱۰ — ارباب حکومت کی چار مشکلات آپ نے گنوائی ہیں، اور آگے نجات کا راستہ بتایا ہے۔ میرے خیال میں اگر وہ پہلی مشکل پہ عبور حاصل کر لیں تو باقی خود ہی حل ہو جائیں گی۔ آپ نے بھی قریب قریب اسی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

۱۱ — اخیر میں آپ نے بجا فرمایا ہے کہ اسلام اسی وقت تک مشکل اور ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے، جب تک معاشرہ غیر اسلامی ہے۔ "موجودہ معاشرے کے اندر اکیلا سچ بولنے والا پس کر رہ جائے گا۔ . . . لیکن جب معاشرہ بدل جائے تو اس وقت سارا کاروبار سچ پر مبنی ہو جائے گا، اس وقت جھوٹ کی بنا پر کاروبار ایسا ہی ناممکن ہو جائیگا، جیسے آج سچ کی بنا پر کاروبار ناممکن العمل دکھائی دیتا ہے۔" بس بقول آپ کے ارباب بست و کشاد کی جرأت کی ضرورت ہے۔

۱۲ — آپ کا تیار کیا ہوا مسودہ "قرارداد مقاصد" میں نے بار بار پڑھا، مجھے اس میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو ملک کے کسی طبقے کیلئے مضر ہو، یا کسی طبقے کی صحیح ضروریات کے منافی ہو۔ البتہ اس میں غلط قسم کے مذہبی اور حکومتی اقتدار کا خاتمہ چاہا گیا ہے، اور یہ اقتدار ہی کیا جو ہر وقت خطرے میں ہو اور عنداللہ بھی سخت مواخذے کا موجب بنے۔ صالح اور دوامی اقتدار تو وہی ہے جو رسولوں اور ان کے خلیفوں کو حاصل ہوا، جو ان کی راہ پر چلنے والے تھے۔

اخیر میں مکرر عرض کروں گا کہ ہم ان باتوں کو معرکہ بحث و جدال بنانے کی بجائے، عوام اور حکومت کے سامنے پیش کرنے کی تدبیر کریں، زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، صدر مجلس دستور ساز کراچی کو نجی طور پر متوجہ کریں کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد خالص قرآن پر رکھی جائے اور مسودہ قرارداد مقاصد (مطبوعہ طلوع اسلام نومبر ۱۹۵۰ء) کو مجلس پاکستان کے سامنے پیش کیا جائے۔

یاد رہے کہ صداقتوں کا وہ انبار جس کی پشت پر کوئی جماعت عاملہ نہ ہو، ایک ردی کے ڈھیر کی طرح بیکار ہے۔

اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟

(شعبۂ فلسفہ میں)

محترم ایس، این، باقر صاحب، نائب معتمد امور داخلہ
(کی ایک تقریر)

جن مشاہیر سلف کے نقوش قدم، تاریخ کی ریگ رواں پر مثل کہکشاں درخشندہ ہیں ان میں ارباب فکر (فلاسفرز) کا مقام بھی کچھ کم بلند نہیں۔ اسلام نے جہاں دنیا کو دیگر علوم و فنون کی برکات سے اس قدر بہرہ یاب کیا، فلسفہ کے میدان میں اس کی موہبات بھی بہت گراں قدر ہیں۔ اگرچہ عام جہالت اور مذہبی تعصب کی وجہ سے، دنیا نے اسلام کی اس احسانمندی کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ لیکن اب اس جہالت اور تعصب کے بادل چھٹ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ رہی ہے۔

اقوام عالم کی تاریخ میں ہوتا یہ رہا ہے کہ کبھی کبھی کچھ افراد ابھر کر سامنے آ گئے جنہوں نے محض اپنی افتاد طبیعت کی بنا پر فلسفیانہ مباحث پر غور و خوض شروع کر دیا اور اس طرح وہ دنیا کی فکری متاع میں کچھ اضافہ کر گئے۔ یہ نہیں ہوا کہ ان کی قومی ثقافت ان کی فکری کاوشوں کے لئے محرک بن گئی ہو۔ لیکن مسلمانوں میں فلسفیانہ نہج فکر کی نشو و نما بالکل جداگانہ انداز سے ہوتی ہے۔ ان کی فکری کاوشوں کا محرک خود ان کا آئین حیات (قرآن) تھا۔ بنیادی طور پر قرآن ایک ضابطۂ زندگی ہے جو نظریہ کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ لیکن یہ ضابطۂ زندگی علم و بصیرت پر مبنی ہے اور اس نے اپنی صداقت کے لئے استنتاجی معیار مقرر کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ میری دعوت اِلی اللہ علیٰ وجہ البصیرت ہے اور اس کی سچائی کا ثبوت اس کے نتائج ہیں۔ جب کسی قوم کے ضابطۂ زندگی کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ علم و بصیرت پر مبنی ہے، تو اس قوم میں فکری نشو و نما کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی کا نام فلسفیانہ کاوش ہے۔

اسلام کا ابتدائی دور، عمل کا دور تھا جس میں مجرد فکر کی گنجائش یا کم از کم ضرورت نہ تھی۔ اس وقت تو یہ حالت تھی کہ اُدھر ایک حکم ملا اور ادھر قوم نے اس حکم کو عمل میں متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس وقت اس کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت کہ ان احکام کی فلسفیانہ توجیہات اور منطقیانہ تشریحات میں الجھا جاتا۔ قوم کے سامنے ایک بلند نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہر ایک کا مطمح نگاہ۔ اس لئے اس وقت نظری مباحث کی کسی کو فرصت ہی نہ تھی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

مسلمانوں کی تاریخ میں مجرد فکر کی ابتداء عباسیوں کے زمانہ سے ہوئی۔ ہوا یہ کہ اسلام کی سادہ اور پر عمل تعلیم کی کشش سے غیر مسلم فوج در فوج حصار اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ اس سے یہودی، نصرانی اور مجوسی مذاہب کے ارباب بست و کشاد کو بڑا خطرہ لاحق ہوا کہ اگر یہ افتاد اسی طرح جاری رہی تو ایک دن ان کے مذاہب کا وجود ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ وہ عمل کے میدان میں

مسلمانوں کا مقابلہ کر نہیں سکتے تھے۔ اس حقیقت سے وہ اچھی طرح باخبر تھے۔ اس لئے انھوں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ انھوں نے کہا کہ کسی طرح مسلمانوں کو نظری مباحث میں الجھا دیا جائے، اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ ان کی توجہ عملی میدان سے ہٹ جائے گی اور دوسرے یہ کہ چونکہ نظری مباحث کا مدار منطق اور فلسفہ پر ہوگا اور مسلمان اس میدان کے شاہسوار نہیں، اس لئے ہم انھیں شکست پر شکست دیتے چلے جائیں گے۔ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کو اپنے انداز پر سوچنے اور اپنی فکر کو بلا جھجک پیش کرنے کی آزادی تھی۔ اس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور اسلام کے خلاف منطقیانہ اعتراضات شروع کر دیئے۔ خدا کی ذات کیسی ہے؟ اس کی ذات اور صفات میں کیا تعلق ہے۔ کیا خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے یا عرش پر مکین ہے۔ روح کسے کہتے ہیں۔ ازل اور ابد سے کیا مفہوم ہے۔ وغیر ذالک متکلمانہ مباحث کا دروازہ کھل گیا۔ شروع شروع میں تو مسلمانوں نے ان مباحث میں اجنبیت سی محسوس کی لیکن چونکہ غور و تدبر اور فکر و تعقل کی دعوت خود قرآن میں موجود تھی اس لئے انھیں اس میدان میں اترنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوئی۔ اس زمانہ میں متکلمانہ مباحث کا ماخذ یونانی فلسفہ تھا۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے اس فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں کا کچھ اور ترکہ نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی کارنامہ کہ انھوں نے یونانی فکر کو عربی جیسی زبان میں منتقل کر دیا، بجائے خویش نہایت گراں ثمن تھا۔ لیکن فلسفۂ یونان کا عربی ترجمہ تو محض ایک ذریعہ تھا فلسفیانہ مباحث کے میدان میں اترنے کا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ان غیر مسلم معترضین سے ان تمام امور پر بحث و تمحیص شروع کر دی۔ جس گروہ نے سب سے پہلے اس نہج پر گفتگو شروع کی وہ تاریخ میں معتزلہ کے نام سے معروف ہے۔ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ غیر مسلموں کے اعتراضات کو ختم کر کے، مسلمانوں نے خود آپس میں نظری مسائل کو متکلمانہ مباحث کا موضوع بنا لیا۔ مامون الرشید کے عہد میں اس فلسفیانہ انداز تکلم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود مامون الرشید نے قرآن کے حدوث و قدم کی بحث اٹھائی۔ یعنی یہ بحث کہ قرآن مخلوق ہے یا ابدی۔ وہ (اور معتزلہ) "خلق قرآن" کے حامی تھے۔ چونکہ ان کی بحث زیادہ تر متکلمانہ تھی اس لئے مسلمانوں کے دوسرے گروہ کو بھی، جو اس عقیدہ میں ان کے خلاف تھا، مجبوراً یہی انداز گفتگو اختیار کرنا پڑا۔ اس سے "قدامت پسند" طبقہ میں بھی فلسفیانہ نہج فکر کا رواج ہو گیا۔ یہی آگے چل کر اشعریہ کے نام سے معروف ہوئے۔

مسلمانوں میں فلسفیانہ غور و فکر کی ابتدا تو اس ضرورت کے ماتحت ہوئی لیکن آگے چل کر ان میں ایسے ایسے ممتاز فلاسفر پیدا ہو گئے جن کا شمار دنیائے فکر کے عمائدین میں ہوتا ہے۔ مثلاً ابو یوسف اسحٰق الکندری (پیدائش ۸۵۰ء) جس نے ارسطو کے فلسفہ کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یا الفارابی (متوفی ۹۵۰ء) افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ پر اس کا محاکمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ الفارابی نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ "زمان اس حرکت کا نام ہے جس سے اشیائے کائنات میں رابطہ قائم ہے"۔ الفارابی کا محاکمہ اور زمان کے متعلق یہ نظریہ صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب رائج رہا۔ فارابی کے بعد شیخ ابن سینا کو دیکھئے (متوفی ۱۰۳۷ء)۔ اگرچہ شیخ کی شہرت کا خصوصی میدان علم طب ہے لیکن فلسفہ کے میدان میں بھی اس کی تحقیقات کا مرتبہ ایسا بلند ہے کہ سترہویں صدی تک یورپ انہی کے نقوش قدم کا تتبع رہا۔ بیکن جو یورپ میں استقرائی علم کا موجد تصور کیا جاتا ہے، ابن سینا کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ارسطو کے فلسفہ کا معتدبہ حصہ اہل یورپ کی نگاہوں سے مستور رہا۔ یا تو اس لئے کہ اس کے مخطوطات نایاب تھے یا اس لئے کہ یہ موضوع سخت مشکل تھا۔ حتیٰ کہ ابن سینا اٹھا اور اس نے اس کا سارا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

بغداد کی تباہی کے بعد مسلمانوں کی علمی کاوشوں کا مرکز ہسپانیہ کی طرف منتقل ہوگیا۔ اندلسی مفکرین میں ابن مسرہ (پ ۸۸۳ء) کا نام السابقون الاولون میں ہے۔ دسویں صدی میں اس کا فلسفہ نہ صرف ہسپانیہ بلکہ فرانس اور اٹلی تک افق ذہنی پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد ابن طفیل کو دیکھیے جس کی عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور پھر ابن رشد (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) جسے اہل یورپ کم از کم اٹھارہویں صدی تک فلسفہ کا امام تسلیم کرتے رہے ہیں۔ سنٹرل ایشیا کے مفکرین میں امام غزالی (۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء) کا نام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امام غزالی فی الحقیقت بحر العلوم تھے۔ شروع میں یہ خود فلاسفر تھے لیکن آخری عمر میں انھوں نے وہی دلائل جو کبھی فلسفہ کے حق میں دیئے تھے، خود فلسفہ کے خلاف استعمال کئے اور ان کے زور پر تصوف اور دینیات کو بہت آگے بڑھایا۔

اس مختصر سی صحبت میں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں کی تمام کوششوں کا تفصیلی تذکرہ کرسکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مقصود پیش نظر کے لئے اتنا ہی کافی ہوگا کہ میں اپنی گفتگو کا خاتمہ ایک ایسی شہادت پر کردوں جو یورپ میں نہایت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ یہ شہادت ہے رابرٹ برفو کی جس کی کتاب "تشکیل انسانیت" مغربی مفکرین میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ، پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ یہ درحقیقت رہین منت ہے عربی اور اندلسی اثرات کی۔ یورپ کی بعثت ثانیہ کا گہوارہ، اٹلی نہیں، ہسپانیہ ہے۔ جس وقت یورپ کی تہذیب، گرتے گرتے، وحشت و بربریت کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی، اس وقت تہذیب و تمدن کی تابناک شمعیں، بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کی گلیوں میں روشن تھیں اور یہ شہر آنے والی تہذیب اور ثقافت کے مرکز بن رہے تھے۔ دنیا کی نئی زندگی نے انہی شہروں میں آنکھ کھولی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی موجودہ تہذیب کا کہیں وجود نہ ہوتا۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہوگی کہ اسلام کا ابتدائی دور، خالص عمل کا دور تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب عمل کے ساتھ فکر کا امتزاج ہوا۔ ازاں بعد تیسرا دور جس میں عمل ختم ہوگیا اور صرف فکر باقی رہ گئی۔ اور اس کے بعد وہ دور جس میں نہ عمل رہا نہ فکر۔ قوم کے قوائے عملیہ معطل ہوگئے اور قوائے فکریہ مفلوج۔ ساری کی ساری قوم پر بدہوشی چھاگئی۔ لیکن اس کے بعد پستی کی ان مہیب تاریکیوں میں شعاع امید نمودار ہوئی جو دنیا میں فکر اقبال کے نام سے متعارف ہوئی کہ جس کی عظمت کے سامنے اہل یورپ نے اپنا سر جھکایا۔ اقبال نے ہمیں پھر فکر اور عمل کے اس امتزاج سے روشناس کرایا جو قرآن کی خصوصیت تھی۔ اس سے اب ایک نئی دنیا وجود میں آرہی ہے، جس میں انسانیت، قرآن کی روشنی میں اپنے نصب العین کی طرف بڑھتی چلی جائے گی۔

وذالک الفوز العظیم۔

المیزان

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

قوموں کی زندگی کا راز افراد قوم کے دل و دماغ کی تعمیر میں مضمر ہے۔ اور افراد کے قلب و نگاہ کی تعمیر منحصر ہے ان کی تعلیم پر۔ تعلیم نتیجہ ہوتی ہے اس لٹریچر کا جو اس قوم میں رائج ہو۔ لہٰذا کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ لگانے کیلئے اس لٹریچر کو دیکھنا چاہیے جو اس قوم میں پیدا ہو رہا ہو۔

اس نقطۂ نگاہ سے ذرا اپنے مستقبل پر نگاہ ڈالئے، حقیقت نکھر کر سامنے آجائیگی۔ ہمارے لٹریچر کا بیشتر حصہ ادبی کہلاتا ہے جو قوم کے نوجوانوں کے سفلی جذبات سے کھیلتا ہے، دوسرا حصہ جسے عام طور پر مذہبی لٹریچر کہا جاتا ہے، زندگی کے مسائل سے یکسر بیگانہ، بلکہ ان سے نفرت دلانے کا موجب ہوتا ہے۔ باقی سیاسی لٹریچر، سو اس کا مقصود بالعموم ہنگامہ پروری اور "سنسنی خیزی" ہوتا ہے۔ قوم کا نوے فی صدی حصہ جاہل ہے اور لکھا پڑھا طبقہ اس قسم کے لٹریچر کے گرداب میں ماخوذ۔ ہمارے ہاں ایسا لٹریچر شاذ ہے جو قوم کے سامنے مستقل اقدار کو اجاگر کرے۔ انہیں بتائے کہ ان کی زندگی کا مقصود کیا ہے۔ دنیا کے عملی مسائل کیا ہیں۔ انہیں ان کے حل میں کیا کیا دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ کیا ہمارے پاس ان کا کوئی حل ہے۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اگر کہیں اس قسم کے صحیح لٹریچر کی مثالیں ملتی ہیں تو اس کا دائرہ بہت محدود ہے جس سے قوم کا سوادِ اعظم متاثر نہیں ہو سکتا۔ —— کراچی میں حساس قلوب کا ایک مختصر سا گروہ ایک عرصہ سے اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اسے پورا کرنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ انہوں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں۔ اس کیلئے ان حضرات کے اجتماعی تعاون کی ضرورت ہے جو سمجھتے ہیں کہ ہمارا مستقبل قرآن سے وابستہ ہے اور جب تک قرآنی فکر کو عام نہ کیا جائے ہماری زندگی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے "المیزان پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ" کے نام سے ایک اجتماعی ادارہ کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ کمپنی رجسٹر ہو چکی ہے اور اس کے ضابطۂ مقصود کی پہلی شق یہ ہے کہ

اس کمپنی کا مقصد اس قسم کے لٹریچر کی نشر و اشاعت ہے جو قرآنی فکر کو عام کرے۔

سرِدست کمپنی کے پیش نظر یہ ہے کہ —— (۱) ایک اعلیٰ درجہ کا پریس قائم کیا جائے جس میں طباعت کا نہایت عمدہ انتظام ہو —— (۲) ایک اردو روزانہ اخبار جاری کیا جائے جو عام سطح سے بلند ہو کر قوم کے سیاسی شعور کو اس طرح بیدار اور مربوط کر دے کہ قوم زندگی کے عملی مسائل پر قرآنی روشنی میں از خود سوچنے کی اہل ہو جائے —— (۳) اس روزنامہ کے ہفتہ وار یا ماہوار ایڈیشن عربی اور فارسی میں شائع کئے جائیں جن سے دیگر اسلامی ممالک سے رابطہ پیدا کیا جائے اور انہیں بھی قرآنی فکر کی طرف دعوت دی جائے —— (۴) ایک انگریزی ہفتہ وار جریدہ شائع کیا جائے جو ہمارے انگریزی خواں نوجوان طبقہ کی ذہنی اور قلبی تعمیر کا ذریعہ بن سکے —— (۵) ایسی کتابیں شائع کی جائیں جو قرآن کی روشنی میں زندگی کے عملی مسائل سے بحث کریں، اور جنہیں ہم دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ دیکھو اسلام تمہاری مشکلات کا حل کیا پیش کرتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے عزائم —— خدا ہمیں کامیاب کر دے —— لیکن یہ موقوف ہے اس بات پر کہ ان مقاصد سے ہمدردی رکھنے والے کتنے ہیں اور وہ باہمی تعاون کیلئے کس حد تک تیار ہیں —— کمپنی کا سرمایہ سرِدست دو لاکھ روپیہ تجویز کیا گیا ہے اور ایک حصہ کی قیمت ایک سو روپیہ ہے۔ دیگر معلومات کمپنی کے مطبوعہ "میمورنڈم اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن" سے مل سکتی ہیں جو ایک روپیہ موصول ہونے پر بھیجے جا سکتے ہیں۔

سرِدست خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کیجئے اور لفافہ کی پیشانی پر "المیزان لمیٹڈ" کے الفاظ تحریر فرمائیے۔

(ڈاکٹر) اے۔ حمید۔ مینجنگ ڈائرکٹر، المیزان لمیٹڈ

معرفت۔ جنرل ہومیو اسٹورز۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

حقیقتِ حدیث

(علامہ حافظ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس رسول امین پر اترا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس روح الامین کے توسط سے اتارا گیا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

بخلاف اس کے نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں۔

حدیث کی صورت یہ ہے کہ زید نے کہا میں نے سنا عمرو سے، اُس نے سنا تھا بکر سے، اس نے بیان کیا تھا خالد سے، اس سے کہا تھا اصغر نے، اُس نے سنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسا بیان روایت در روایت در روایت در روایت نہ علم ہے نہ شہادت اور نہ دنیا کی کسی عدالت کے نزدیک قابلِ سماعت ہے۔ پھر یہ حجت کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں ایک بات حدیث میں ہے، وہ یہ کہ اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کی بدولت اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں حدیثیں راویوں نے اپنے اپنے خیالات اور اغراض کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں وضع اور کذب سے کام لیا ہے تو اس نسبت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ اگر یہ ہوتا کہ ہر ایک روایت کے آخری راوی سے ثبوت طلب کیا جاتا کہ تم نے جو فلاں سے اس کو سنا ہے، اس کے دو گواہ عادل پیش کرو جو شہادت دیں کہ ہمارے سامنے اس نے یہ روایت کی پھر اسی طرح سلسلہ کے ہر ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ آخر تک ہوتے تو بھی روایت کا کچھ اعتماد قائم ہوتا، مگر یہاں تو نہ کوئی ثبوت ہے نہ شہادت ہے۔ ہر راوی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی گواہ ہے اور خود ہی ثبوت ہے[1] یعنی کسی بات کو آنحضرت صلعم کی طرف بسلسلۂ روایت در روایت منسوب کر دینا اسی کا نام حدیث ہے، لہٰذا جملہ روایات کسی قسم کے ثبوت سے عاری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جو رواۃ ہیں وہ معتبر ہیں لیکن یہ اعتبار کس بنیاد پر قائم ہوا ہے؟ صرف ان کے ہم عصروں کے بیانات پر

[1] اگر کوئی روایت متعدد طُرق سے مروی ہے تو ہر ایک طریق بالکل اسی طرح بے دلیل ہے اور ثبوت کا محتاج۔

یہ بیانات خود حجت نہیں، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں باہم دگر سخت اختلافات ہیں اور ہزاروں ہیں، جن کو اگر ایک سچا سمجھتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔ ائمہ نے رواۃ کی جو توثیق کی ہے وہ صرف عرفِ عام کے مطابق ہے نہ کہ حقیقت کے۔ ایسی ظنی اور تخمینی ثقاہت تاریخ میں تو کچھ کارآمد ہو سکتی ہے، لیکن دین میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا دارومدار علم و یقین پر ہے۔ قرآن میں تصریح ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل آیہ ۳۶)

اس کے پیچھے نہ چل، جس کا تجھ کو یقین نہیں ہے۔

حدیثیں دین کیونکر بنیں؟

قرآن کریم اسلام کی مستقل اور کامل کتاب ہے، جس میں اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اور جس کی حفاظت ہمیشہ کے لئے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی کتاب عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ میں ملتِ اسلامیہ کا دستور العمل رہی، لیکن جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو وہ حکومتِ الٰہیہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی، انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ ان نام نہاد خلفائے (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے) اپنا ذاتی تسلط ملت پر جمایا اور خزانہ اور ملک پر قبضہ کر کے فوج کو اپنے قابو میں کیا اور اس کی قوت سے آزاد مسلمانوں کو جو صرف اکیلے اللہ کے محکوم اور مطیع تھے، اپنی رعایا اور غلام بنایا اور ان کی دینی قیادت اور راہنمائی جو خلیفۂ اسلام کا اولین فریضہ تھی، علما کے ذمہ چھوڑ دی۔ اس وقت سے سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ سیاست کا مرکز تو یہی خلفاء رہے اور دین لامرکزی صورت میں علما کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان کے اجتہادات اور استنباطات میں اختلافات کا پڑنا لازمی تھا جن کے فیصلے کیلئے کوئی مرکز نہ تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کے لئے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔ بنی امیہ کے عہد میں چونکہ سادہ عربی زندگی تھی، اس وجہ سے روایات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہوا، لیکن بنی عباس کے زمانہ میں جب مختلف علوم و فنون کے ترجمے کئے گئے اور متعدد عجمی اقوام سے اختلاط ہوا، اور خیالات، افکار اور دینی مسائل میں بہت وسعت پیدا ہو گئی، اس وقت روایت نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا اور چونکہ روایت کشی کیلئے کسی لیاقت یا معیارِ علم کی شرط نہیں تھی، اس لئے ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوتا، اس میں حصہ لے کر دینی عزت اور دنیاوی بزرگی حاصل کرنے لگا اور روایت ایک عام مشغلہ ہو گئی اور ہر شہر میں رواۃ کی تعداد کی کوئی قدر نہ رہی۔

قرآن کو خلفاء بنی امیہ (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ) اور خلفائے بنی عباس نے جو در اصل مستبد سلاطین تھے، سیاست سے پہلے ہی متروک کر دیا تھا۔ اب ان راویوں نے دینی حیثیت سے روایتوں کے اندر اس کو دفن کر دیا اور اس کی تشریح و تفسیر بھی انھیں سے ہونے لگی اور حدیث کا تسلط اس قدر بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے فرمایا کہ "قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں" اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے"[1]۔ حدیثوں کے ذریعہ سے قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام، مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید، بلکہ اس پر اضافے کرنے لگے۔

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳ مطبوعہ مصر

نیز بعض ائمۂ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دیدیا اور اس طرح قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدیثوں کے ماتحت بنا دیا جن کی بدولت دین میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہو گئیں جن کا قرآن میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

موضوعات حدیث نے جب فن کی صورت اختیار کر لی اور روایات دین قرار پا گئیں تو ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی اور ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔ ائمہ حدیث نے جب تنقید کی طرف توجہ کی تو ان کو موضوعات کا ایک انبار ملا۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب "موضوعات کبیر" میں لکھا ہے کہ "زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں"۔ شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھتے ہیں کہ جوئباری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء زندیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔ وضاعین کی سب سے پہلی فہرست امام ابو عبداللہ برقی متوفی ۲۷۴ھ نے تیار کی۔ اس کے بعد دیگر ائمہ جرح و تعدیل نے اس میں کتابیں لکھیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

کتاب الضعفاء[1]	امام بخاریؒ متوفی ۲۵۶ھ
"	ابو اسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ
"	ابو جعفر عقیلی متوفی ۳۲۲ھ
"	ابو نعیم استر آبادی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور ہے اور بارہ جلدوں میں ہے)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ کے نام سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی حصہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کی مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین کی اتنی بڑی جماعت ہو گئی جن کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے جانے لگے اور صدیوں کا زمانہ ان کو مل گیا، جس میں ان کے اوپر نہ کوئی پابندی تھی، نہ کسی قسم کی گرفت، بلکہ عوام میں مقبولیت، شہرت، عظمت اور بزرگی حاصل ہوتی تھی۔ پھر انھوں نے جس قدر حدیثیں وضع کی ہوں گی، ان کو سوائے علام الغیوب کے کون شمار کر سکتا ہے؟

ائمہ حدیث نے وضع حدیث کے مختلف اغراض اور اسباب بھی بیان کئے ہیں مثلاً

ا۔ بنی امیہ کے عہد میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منبروں سے لعنت بھیجنے کا دستور نکالا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؓ کے مثالب میں حدیثیں بنائی گئیں۔ اسی عہد میں روایتوں کے ذریعہ سے ایمانیات میں "تقدیر" کا اضافہ کیا گیا۔

---

[1] ضعفاء کا لفظ ائمہ نے ازراہ احتیاط اختیار کیا ہے کہ شاید ان میں کوئی سچا ہو، ورنہ مراد کذابین ہیں۔

قرآن میں تو ایمان کے صرف پانچ اجزا بتائے گئے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷)

لیکن نیکی کرنے والا وہ ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور انبیاء پر

دوسری آیت میں ہے،

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ (۴/۱۳۶)

اور جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخر کا انکار کیا وہ دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔

لیکن اس میں چھٹا جزو "القدر خیرہ وشرہ کلہ من اللہ" بھی بڑھا یا گیا جو آج تک بدستور چلا جاتا ہے، حالانکہ قرآن نے تقدیر کو دین کی ایک حقیقت بتایا ہے، اس کو ایمانیات میں نہیں داخل کیا ہے۔

۲۔ ردِ عمل کے طور پر بنی عباس کے دعاۃ نے ہزاروں حدیثیں بنی امیہ کے معائب اور اقربائے رسول کے فضائل و استحقاق خلافت میں بنا کر مغرب سے مشرق تک پھیلا دیں۔

۳۔ تختِ خلافت پر آجانے کے بعد عباسیوں نے اپنی حکومت کو دینی رنگ دینا چاہا، اس وجہ سے ان کے ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور فضیلت میں روایات بنائی گئیں۔ ابو الفرج اصفہانی مطیع بن ایاس کے حالات میں لکھتا ہے کہ خلیفہ مہدی اس کا بڑا قدردان تھا، کیونکہ وہ اس کی مہدویت کے بارے میں حدیثیں بنایا کرتا تھا[1]۔

۴۔ اہل بیت کے خلافت سے محروم ہو جانے کے بعد شیعہ ان کی امامت نیز ان میں سے ایک مہدی کے آنے کی بشارت کی روایتیں امت کو سناتے تھے اور اپنے ائمہ کی عصمت و عظمت اور ان کی محبت اور ولا کو جزوِ ایمان اور نجات کا ذریعہ ثابت کرنے کیلئے حدیثیں تراشتے تھے[2]۔ اور یہ سب کچھ محض ان کی نسبی خصوصیت کی بنا پر تھا، حالانکہ قرآن کی رو سے انسان کی قیمت کا معیار اس کے عقائد و اعمال ہیں۔ نسب کی بنیاد پر کسی کو کوئی حق وہ نہیں دیتا بلکہ اس کو صرف تعارف کا ذریعہ اور جینے جی کا رشتہ بتلاتا ہے:

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ۔ (۲۳/۱۰۱)

پھر جب صور پھونک دیا گیا تو اس دن ان میں رشتے ہوں گے اور نہ آپس میں پوچھ گچھ کریں گے۔

اور قیامت کے دن مطلق کار آمد نہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۶۰/۳)

ہرگز تم کو نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رشتے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن۔

---

[1] بنات الثالث والثاني في روايات الاغاني جلد ۱ ص ۲۹۷۔ [2] شیعہ کے نزدیک ہر وہ بات جو ان کے کسی امام معصوم کی طرف منسوب ہو حدیث ہے، اس لئے ان کے یہاں روایات میں بہت وسعت ہو گئی اور اسی نسبت سے موضوعات میں بھی۔

۵۔ قصاص، تذکر اور واعظ طرح طرح کے قصے، افسانے اور روایتیں آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرکے اپنے قصص اذکار اور مواعظ کو دلچسپ اور با اثر بناتے تھے۔

۶۔ زندیقوں یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہوگئے تھے مگر در پردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے ایسی ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کر دینے والی تھیں۔

۷۔ مختلف فرقے جو اسلام میں پیدا ہوگئے تھے، ان میں سے اکثر اپنی تائید اور اپنے مخالفوں کی تردید میں حدیثیں گھڑتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ جو متدین اور محترم سمجھے جاتے تھے، اعمال و اذکار کی ترغیب و ترہیب میں روایتیں وضع کرتے تھے، چنانچہ نوح بن مریم نے قرآن کے ایک ایک سورہ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جب لوگوں نے تحقیق کی اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے بے تکلف اقرار کر لیا کہ یہ روایتیں میں نے بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلتیں اور بمقابلہ دیگر انبیا کے جو خصوصیتیں ہیں، ان کو قرآن نے مفصل بیان کر دیا ہے یعنی:

(۱) دیگر انبیاء قبائلی یا قومی ہوتے تھے مگر آپ جملہ بنی نوع انسان کیلئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

(۲) انبیاء سابقین کے اوپر جو کتابیں یا صحیفے نازل کئے گئے وہ سب فنا ہوگئے، آج توریت، زبور اور انجیل کے بھی صرف ترجمے ہیں اور اصل مرفوع۔ لیکن آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی، اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۳) آپ کے اوپر نبوت ختم کر دی گئی اور قیامت تک کے لئے یہی نبوت قائم رکھی گئی۔

(۴) معراج میں انسانی کمال کی آخری حد اور علوم نبوت کے افق اعلیٰ پر پہنچا کر آپ کو اللہ نے جملہ انبیاء کی وراثت اور نبوت کبریٰ سے سرفراز فرمایا۔

ان کے علاوہ بھی جا بجا آیات میں آپ کے صفات اور فضائل کا ذکر ہے اور قرآن نے ان کے بیان کرنے میں کمی نہیں کی ہے، مگر باوجود ان کے رسول پرستی کے جذبہ میں آپ کے مدائح اور صفات میں ہزارہا روایتیں گھڑی گئیں، جن میں سے خود محدثین نے بیشتر کو موضوع قرار دیا۔

یہی حال معجزات کا ہے۔ قرآن نے تصریح کے ساتھ کہا کہ خاتم النبیین کو عقلی معجزہ قرآن کریم دیا گیا جس کو اہل بصیرت قیامت تک دیکھ سکتے ہیں، نہ کہ دیگر انبیاء کی طرح حسی معجزہ[1]۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (۷/۲۰۳)

اور جب تو ان کے پاس کوئی نشان نہیں لایا تو انھوں نے کہا کہ کیوں نہ تو نے کوئی نشانی چن لی، کہہ دے کہ میں تو اسی کا اتباع

---

[1] ان باتوں کی تفصیل ہماری کتاب تعلیمات قرآن میں ملاحظہ فرمائیں۔

کرتا ہوں جو میرے رب کے یہاں سے وحی مجھ پر آتی ہے۔ یہی تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

یہی بات دوسری آیت میں مزید تصریح کے ساتھ ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۔ (۲۹/۵۰-۵۱)

اور کافروں نے کہا کہ کیوں نہ اس کے اوپر کوئی نشانی اتاری گئی۔ کہدے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں میں تو کھلا ہوا آگاہ کرنیوالا ہوں کیا ان کیلئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتاردی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی جس نشانی یا معجزہ کے وہ طلبگار ہیں، اگر ان کے پاس بصیرت ہو تو اس کیلئے قرآن کافی ہے۔

آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ کوئی نشانی جیسی کہ یہ منکرین طلب کرتے ہیں مل جاتی، تو میں ان کو قائل کرکے مسلمان بنالیتا۔ اس پر سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ کسی قدر عتاب کے ساتھ فرماتا ہے:

وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۔ (۶/۳۵)

اگر تیرے اوپر ان کی روگردانی گراں گذرتی ہے تو اگر تجھ سے ہوسکے تو زمین میں کوئی سوراخ تلاش کر یا آسمان پر سیڑھی لگا اور ان کیلئے نشانی لا۔ اللہ اگر چاہتا تو سب کو سیدھے راستہ پر لگادیتا، تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں حسی معجزات نہ دینے کی وجہ بھی بیان کردی۔

وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَن كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۔ (۱۷/۵۹)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔

گذشتہ قوموں نے معجزات طلب کئے، پھر ان کو دیکھ لینے کے بعد جادو اور نظر بندی وغیرہ کہہ کر جھٹلایا، اس لئے اتمام حجت کے بعد ان کا ہلاک کرنا لازم آگیا، لیکن رحمۃ للعالمین کا دور عقل و بصیرت کا دور ہے، جس میں انسان کو خود حقیقت کو سمجھ کر ایمان لانا چاہئے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (۱۸/۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر بنے۔

مگر ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے بھی راویوں نے آنحضرتؐ کے حسی معجزات کی روایات کا انبار لگادیا[1]۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے

---

[1] ان روایات کے مطالعہ کا جس کو شوق ہو، وہ مولانا کرامت علی موسوی دہلوی کی تالیف "السیرۃ المحمدیہ" کو جس میں عجیب غریب ہزارہا معجزات جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مرتب ہوئی بمبئی میں بڑی تقطیع پر ایک خط میں ساڑھے چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔

امت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اولیاء کی کرامات پر بھی ایمان رکھو۔

۱۰۔ مناقب صحابہ میں جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر کو محدثوں نے موضوعات کی فہرست میں داخل کیا ہے۔ دراصل صحابہ کرام کی فضیلت کے لئے وہی آیتیں دینی لحاظ سے کافی ہیں جو مہاجرین و انصار کی مدح میں قرآن میں ہیں اور تاریخی لحاظ سے ان کے کارنامے ان کی عظمت کے شاہد ہیں۔ ان کی برتری اور بزرگی کیلئے روایات کی ضرورت ہی نہیں۔

۱۱۔ علماء اور متعلمین کے فضائل میں جس قدر روایتیں ہیں خود ساختہ ہیں۔

۱۲۔ شخصیت پرستی آجانے کی وجہ سے اشخاص نیز مقامات کی فضیلتوں میں حدیثیں وضع کی گئیں۔

۱۳۔ تصوف جب مسلمانوں میں آیا تو بہت سی متصوفانہ روایتیں بنائی گئیں جو موضوعات جمع کرنے والے محدثوں کے حصہ میں آئیں۔

۱۴۔ آنحضرتؐ کے غزوات، پیش گوئیوں نیز آیات کی تفسیر میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں روایت کی گئیں، جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں[1]۔

الغرض اور کذب کے بہت سے اسباب تھے اور بہت سی راہیں۔ ہر ہر شعبہ میں بے شمار روایتیں گھڑی گئیں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ ملایا گیا۔ لاریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کے متعلق کچھ صحیح حدیثیں بھی ضرور تھیں، لیکن اس جھوٹ کے سیلاب سے جو مختلف راستوں سے آیا، سچائی کے ان قطروں کو یقین کے ساتھ چن لینا انسانوں کیلئے بالکل ناممکن ہو گیا۔ کیا کذب اور وضع سے بڑھ کر دینِ الٰہی کو مذاق بنانے کی اور کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔ (۳۱/۶)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ بلا یقین کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں اور اس (اللہ کی راہ) کو مذاق بنائیں۔

دو قسم کے شیاطین ہر نبی کی عداوت کے لئے دو قسم کے شیاطین (کذابین) ہوتے ہیں جن کی تفصیل قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے۔

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جو نبی کے اوپر اتری ہوئی آیات میں اضافے کر کے ان کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان اضافوں سے اپنی آیات کو محفوظ کر کے محکم کر دینے کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (۲۲/۵۲)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جس وقت اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں (اپنے الفاظ) ڈال دیئے۔ پھر اللہ شیطان کی ڈالی ہوئی باتوں کو نکال کر اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اس لئے "تلک الغرانیق" اور اسی قسم کی قرأت شاذہ کی روایتیں جن سے اللہ نے اپنی آیات کو پاک کر کے محکم کر دیا ہے، ناقابلِ

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲۔

قبول بلکہ ناقابلِ سماعت ہیں۔

۴- دوسری قسم وہ ہے جو دین میں جھوٹی روایتیں گھڑتی ہے اور افترا کرتے ہوئے نہ عاقبت سے ڈرتی ہے نہ اللہ سے شرماتی ہے۔ مفتریوں کی سزا نامرادی ہے "وقد خاب من افتریٰ" یہودیوں نے جھوٹی روایتیں گھڑی تھیں۔ اللہ کے ان کے بارے میں فرمایا:

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ۔ (۳/۲۴)

اور دین میں ان کو دھوکا دیا ان باتوں نے جن کو وہ گھڑتے تھے۔

محدثین کی اس جماعت کو چھوڑ کر جنھوں نے سچائی کی جستجو کی، وضاعین اور کذابین ان آیات کے تحت میں آتے ہیں:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ ۝ أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶/۱۱۲ تا ۱۱۶)

اور ایسا ہی ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے، انسی اور جنی شیاطین جو ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب دینے والی باتیں سکھاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ سو تو ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی باتوں کو چھوڑ دے اور وہ اس لئے (کرتے ہیں) تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اس کو پسند کریں اور وہی کریں جو وہ کر رہے ہیں۔ (تو یہی کہتا رہ) کہ کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو منصف نہ مانوں، حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی ہے اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتری ہے۔ لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور عدل کی رو سے پوری ہیں، کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں ہے، وہ سمیع و علیم ہے اور اگر تو بات مانے گا اکثر لوگوں کی جو دنیا میں ہیں تو وہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو صرف گمان پر چلتے ہیں اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔

ان آیات کی تشریح کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے مگر چند باتیں بالکل واضح ہیں:

۱- ہر نبی کے دین میں وضاعین اور کذابین روایتیں گھڑتے اور پھیلاتے ہیں۔

۲۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ان ہی جیسے عقلی سے بے خوف لوگ ان کی باتیں مانیں اور وہی کرنے لگیں جو وہ کر رہے ہیں۔
۳۔ مومن کو حکم ہے کہ ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کو بھی چھوڑ دے، اور یہی کہے کہ اللہ کے سوا میں کسی کو حکم نہیں مانتا اس نے مفصل کتاب اتار دی ہے (جو کافی ہے)۔
۴۔ اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت میں گمراہی کا ڈر ہے، کیونکہ اکثر لوگ ظنی اور تخمینی باتوں کو دین بنائے ہوئے رہیں۔
یہ اللہ کی اطاعت رسول اور اس کے بعد اس کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگی جو امت کو قرآن کے مطابق چلائیں گے۔ یہ نہیں کہ ظنی روایات کے انبار میں سے ہر ہر فرقہ اپنے اپنے خیال کے مطابق صحیح حدیثیں چن چن کر ان پر عمل کرے اور رسول کی اطاعت کا دم بھرے۔

رفتارِ حدیث عہدِ صحابہ میں حدیثیں بہت کم تھیں۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم روایت اور کتابت حدیث دونوں سے منع فرماتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حدیثیں بڑھتی گئیں اور چونکہ ان میں وضع اور کذب نے راہ پالی تھی، اس وجہ سے اربابِ بصیرت اور اہلِ تقویٰ ان کے قبول کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

امامِ اعظمؒ ائمہ فقہ میں سب سے پہلے امام جن کی امامت آج تک مسلّم چلی آتی ہے، ابو حنیفہؒ متوفی سنہ ۱۵۰ھ ہیں۔ انھوں نے حدیثوں کی قبولیت کیلئے بہت سخت شرطیں رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ راوی فقیہ ہو تاکہ روایت کا موقع، محل، غرض اور مفہوم سمجھنے میں غلطی نہ کرے، اس وجہ سے وہ اخبارِ احاد میں سے ایسی روایتوں کو بھی جو قیاس صحیح کے خلاف معلوم ہوتیں، قبول نہیں کرتے تھے۔ مثلاً قرعہ اندازی کو وہ اصولاً قمار بازی خیال کرتے تھے پھر اس حدیث کو کیسے صحیح تسلیم کر لیتے کہ "آنحضرتؐ جب کسی سفر میں جاتے تو ازواجِ مطہرات میں قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے"۔ اسی طرح ان کے نزدیک مالِ غنیمت میں سے سوار کا حصہ پیادہ سے دگنا تھا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گھوڑے کے دو حصے ہیں اور سپاہی کا ایک۔ یعنی سوار کے تین حصے ہیں۔ جواب دیا "میں ایک چوپایہ کا حصہ ایک مومن سے ہرگز زیادہ نہیں سمجھتا"۔ ان کا قول تھا کہ بیع جب پختہ ہو چکی تو فسخ کا اختیار بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو باقی نہیں رہا۔ کسی نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں فسخ بیع کا اختیار باقی ہے۔ کہنے لگے کہ خواہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں ہوں یا ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی ساتھ سفر کر رہے ہوں؟ یعنی ایسی صورت میں مفارقت تو ہوگی نہیں، پھر بیع بھی پختہ نہ ہو سکے گی۔ وہ قصاص میں (غالباً شلہ کے قیاس پر) غیر فطری اور بے رحمی کے طریقہ کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں میں کچل دیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر بھی دو پتھروں میں کچلوا دیا۔ بولے کہ یہ ہذیان ہے۔ ایک بار ایک شخص نے کوئی سوال کیا، انھوں نے جواب دیدیا۔ اس نے کہا

کہ آنحضرتؐ سے فلاں روایت اس کے خلاف ہے۔ کہا ہم کو ایسی روایتوں سے معاف رکھو۔ ابو اسحٰق فزاری نے ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی، بولے کہ یہ حدیث خرافہ ہے۔ لوگوں نے اسی طرح کے کم و بیش دو سو فتاوے ان کے حدیث کے خلاف گنائے ہیں، اسی وجہ سے ارباب روایت ان سے خفا ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے بعض الناس کہہ کر ان کو ضعفا میں شمار کیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہا کہ ہم نے اللہ کے مقابلہ میں ابو حنیفہؒ سے زیادہ جرأت کرنے والا نہیں دیکھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ دراصل ان روایات کی نسبت کو رسول اللہؐ کی طرف صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انھوں نے جو دقیق شرطیں حدیث کی صحت کے لئے رکھی تھیں ان کے مطابق وہ نہیں اترتی تھیں۔ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "جو روایت قرآن کے خلاف پڑتی ہو، وہ رسولؐ کا فرمان ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا قرآن اور سنت (اسوۂ رسولؐ) کو معیار سمجھ کر انھیں پر روایتوں کو جانچا کرو۔" مکی نے بھی "مناقب ابو حنیفہ" ص ۱۹ میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ "روایت کا رد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب نہیں ہے بلکہ اس کی تکذیب ہے جو غلط بات کو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ورنہ آپ کا فرمان سر اور آنکھوں پر۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ آپ نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو اور نہ کوئی بدعت یعنی نئی بات اپنی طرف سے کہی۔"لہ

موطا

امام اعظمؒ کے بعد ہی امام مالک کا زمانہ ہے بلکہ ان دونوں اماموں کو ہم عصر سمجھنا چاہئے۔ امام ابو حنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پاگئے اور امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ میں ہوئی۔ ان کی کتاب موطّا خیر القرون کے عمل متوارث کا مجلہ دینی کتابوں سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے کیونکہ مدینہ منورہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علمائے تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم و بیش بارہ ہزار صحابہ تھے جن میں سے تقریباً دس ہزار دہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے بقیہ دو ہزار دیار و امصار یعنی عراق و مصر و شام و یمن وغیرہ میں پھیلے۔ اس لئے شریعت کا اصلی اور صحیح ذخیرہ مدینہ ہی میں ہو سکتا تھا۔ یہ خوبی اتفاق ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جسقدر دینی کتابیں ہیں، ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدون ہوئی وہ مدینہ میں ہوئی، یعنی یہی موطا۔ اس کتاب میں اہل مدینہ کے پاس اسوۂ رسولؐ و خلفاء راشدین و صحابۂ کرام و تابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر مسائل اور فتاوے ان کے معمول بہ تھے وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں۔

شارحین کے بیان کے مطابق امام موصوف نے اپنی وفات سے چالیس سال پہلے اس کو مرتب کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ اس وجہ سے اس کی تالیف کا زمانہ ۱۳۹ھ سمجھنا چاہئے۔ یہ کتاب چالیس سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی اور اسی کا درس وہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے۔ اس کی شرح زرقانی کے مقدمہ میں ہے کہ جب امام موصوف نے اس کو

لہ تفہیم الاسلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۵ - یہ سمجھا گیا ہے کہ امام اعظمؒ کی شان کو ہی سے عدم حجیت حدیث کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ غالباً وہ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق حجت مانتے تھے۔ میرا استدلال تو قرآن کریم سے ہے۔

مدون کیا تھا، اس وقت اس میں چار ہزار حدیثیں تھیں لیکن وہ سال بسال کانٹ چھانٹ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے انتقال کے وقت اس میں صرف ایک ہزار روایتیں رہ گئیں۔ اس تعداد میں مراسیل بھی شامل ہیں متصل السند حدیثیں اس کے مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک ہیں۔ معلوم نہیں کہ امام موصوف اور زندہ رہتے تو اس تعداد میں بھی کس قدر کمی ہوجاتی، کیونکہ حدیثوں کو وہ ظنی ہی سمجھتے تھے اور ان کے متعلق یہ آیت پڑھا کرتے تھے[۵۲]:

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۴۵/۳۲)

ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں، ہم کو یقین حاصل نہیں ہے۔

یہ ہے وہ کل ذخیرہ حدیث وفقہ کا جو مرکز اسلام مدینہ منورہ کا سرمایہ ہے۔ یہ امت کے اسلاف کرام کا ترکہ ہے جو امام مالکؒ کی وساطت سے اس کو وراثت میں ملا ہے۔ بیشک امام ابن حزمؒ کے قول کے مطابق اس میں بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں، مثلاً رجم زانی کی روایت نیز اس کے بعض فقہی مسائل میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے لیکن قرآن سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

قانونِ عام

خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں چونکہ زندگی سادہ تھی اور مسائل شرعیہ میں علمی موشگافیاں نہیں ہوتی تھیں اس وجہ سے سلطنت کیلئے عام قانون کی ضرورت کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی، مگر خلفاء عباسیہ نے اپنے تسلط پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی، اس لئے ان کی خواہش یہ ہوئی کہ ایک مرکزی قانون بنا لیا جائے جن پر سب لوگ چلیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکمرانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جس سے سب لوگ واقف ہوں۔ پھر زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم واصلاح ہوتی رہے چنانچہ منصور نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ موطا کو سلطنت کا قانون عام قرار دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہوچکا ہے۔ منصور نے کہا کیا مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے، مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم مفتی دیارِ مصریہ کے خیال میں امام مالکؒ کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ خبر احاد حجت نہیں ہے، جس کی رو سے کوئی بات کسی پر لازم کی جائے، وہ لکھتے ہیں[۵۳]:

انما یجب العمل باحادیث الاحاد علی من وثق بھا ولکن لا یجعل تشریعا عاما

اخبار احاد پر عمل اس کیلئے واجب ہے جو ان پر وثوق رکھتا ہو، وہ قانون عام نہیں بنائی جا سکتیں۔

اس ذیل میں صحیح بخاری کا ذکر بھی مناسب ہے جو علم حدیث کے انتہائی عروج کے زمانہ میں لکھی گئی۔

---

[۵۲] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۱۳۔ [۵۳] تفسیر القرآن جلد ا ص ۱۳۸۔

صحیح بخاری امام محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی مرتب کی ہوئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی موطا کے ایک صدی کے بعد لکھی گئی جب کہ علم حدیث اپنے معراج پر پہنچ چکا تھا اور امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے امام احمد بن حنبلؒ ۶ لاکھ اور امام یحییٰ بن معین بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔ مقدمۂ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا، جن کو درج کیا۔ ان میں مکررات بھی شامل ہیں، اگر وہ نکال دی جائیں تو حافظ ابن حجرؒ شارح بخاری کے بیان کے مطابق تعلیقات وغیرہ کو چھوڑ کر موصول السند احادیث کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔

یہ خالص حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں فقہ صرف اسی قدر ہے کہ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے۔ حدیث میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کی گئی ہے اور اس کی جملہ روایات صحیح مانی گئی ہیں۔

لوگوں کا بیان ہے کہ امام بخاریؒ نے جن حدیثوں کو چھوڑ دیا وہ سب کی سب ضعیف یا غلط نہ تھیں، مگر جن کو انھوں نے چھوڑ دیا، ان کے متعلق بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم کو تو ان روایتوں کو دیکھنا ہے جو انھوں نے لی ہیں کہ کیا وہ سب کی سب صحیح ہیں؟

اس میں کچھ شک نہیں کہ امام بخاریؒ حدیث کے بلند پایہ امام تھے اور صحیح روایتوں کو لینے کیلئے جن جن لوازم اور شرائط کی فن رجال کی رو سے ضرورت تھی انھوں نے سب کا لحاظ رکھا، مگر باوجود ان سب کے چونکہ محدثین کا مدار صرف اسناد کی صحت پر رہ گیا تھا، اس لئے اس کتاب میں ایسی حدیثیں بھی آگئیں جو درایت کی رو سے صحت کے معیار پر نہیں اترتیں۔ مثلاً اس کے صرف ایک باب کتاب الانبیاء کو لے لیجئے۔ اس میں ہے کہ

۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اس امید میں کہ ان کی ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنے گی ایک رات میں اپنی نوے بیویوں پر گشت لگایا۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ نے ملک الموت کو جب وہ ان کی جان نکالنے آیا، ایسا تھپڑ مارا کہ واپس لوٹ گیا۔

۳۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو ساٹھ گز کا پیدا کیا۔

یہ اور اسی قسم کی بعض دیگر روایتیں جو اس میں ملتی ہیں اگر ان کو درایتاً دیکھا جائے اور عقل اور قرآن کی کسوٹی پر کسا جائے تو صحیح نہیں ثابت ہوتیں۔ پہلی روایت نہ صرف عقل بلکہ انسانی فطرت کے لحاظ سے ناممکن ہے۔

دوسری روایت قرآن سے معارض ہے جس نے عالم ملکوت کے ان محافظوں کو جو انسانوں پر متعین کئے جاتے ہیں، ملک الموت کہا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا۔ (۶/۶۱)

اور اللہ تمہارے اوپر محافظوں کو بھیجتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں کسی کی موت آتی ہے تو (وہی) ہمارے فرستادے اسکی جان نکال لیتے ہیں۔

سورۂ سجدہ میں ہے:۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (۳۲/۱۱)

کہہ دے کہ موت کا وہ فرشتہ تمہاری جان نکالتا ہے تمہارے اوپر مقرر ہے۔

یہ غیر مادی موکل نہ تھپڑ مارے جاسکتے ہیں نہ تھپڑ کھا کر واپس لوٹنے والے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شانِ جلالی کو اس انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے جیسے کوئی عامل کسی رئیس کے پاس وصولی کے لئے کسی پیادہ کو بھیجے اور وہ اپنے زعم ریاست میں تھپڑ مار کر اس کو بھگا دے حالانکہ انبیاء کرام کا شیوہ رضا برضائے الٰہی ہے۔

تیسری روایت صحیح تاریخ کے خلاف ہے۔ چنانچہ خود صحیح بخاری کے بہترین شارح حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ "اقوام کے آثار سے جہاں تک پتہ لگ سکا ہے، انسان کا قد اتنا بڑا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اب تک کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے"[1]

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، امام بخاریؒ نے اپنے شروط کی مراعات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی کیونکہ وہ جرح و تعدیل کے مسلّم اور مستند امام ہیں، لیکن ان اسرائیلیات کے ان کی کتاب میں درج ہو جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) وضاعین اپنی روایتوں پر ثقہ راویوں کے نام چسپاں کر دیتے تھے اور یہ امر بہت مستبعد ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا امام بھی اس قسم کی جملہ تدلیسوں سے باخبر تھا۔

(۲) خود فنِ رجال ظنی ہے، اس لئے اس کے اصول کی مراعات سے بھی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں ہو سکتی جس کے چند وجوہ یہ ہیں:۔

(۱) اس فن میں رجال کے صدق و کذب کا مدار ان کے ہم عصروں کی شہادتوں پر رکھا گیا ہے، حالانکہ یہ ایسی باطنی صفتیں ہیں جن کے اوپر سوائے ظنی اور تخمینی کے یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔

(۲) یہ ہم عصروں کی شہادتیں بھی ہم خیالی، استادی، شاگردی اور دیگر عواطف و میلانات پر مبنی ہیں۔ چنانچہ سنی شیعہ راویوں کو اور شیعہ سنی راویوں کو من حیث الجماعت غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے روایت نہیں لیتے۔

(۳) اس فن کی رو سے جو صادق قرار پا گیا اس کی ہر روایت سچی اور جو کاذب قرار پا گیا، اس کی ہر روایت جھوٹی سمجھی جاتی ہے اور یہ واقعیت کے خلاف ہے، کیونکہ یہ کیا ضرور ہے کہ جس کو آپ سچا کہہ دیں وہ ہمیشہ سچ بولے اور جس کو جھوٹا کہہ دیں اس کی ہر بات جھوٹی ہو، اس لئے یہ فن حقیقت سے بعید ہو گیا۔ ملا علی قاری کا یہ قول کہ

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۶۱۔

یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہتے ہے وہ صحیح ہو۔ [1]

دراصل فن رجال پر صحیح تنقید ہے اور انھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ نہ صرف روایات بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے۔

ان ظنیات کو دینی حجت ماننے کی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں ہے کہ

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)

ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک راہ پر پایا اور ہم بھی انھیں کے نقوش قدم پر رستہ سے لگے ہوئے ہیں۔

اختلافات چونکہ جرح و تعدیل ظنی ہے اور روایات کی تصحیح اسی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس وجہ سے محدثین کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں، جن سے مختلف فرقے اور خیال کے لوگ اپنے اپنے حسب منشا استدلال کرتے ہیں۔ ان میں باہم مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، ان میں اس قدر تکلف ہے کہ مخالفوں سے تسلیم کرانا مشکل ہے اور بعض بعض تو اس قدر متضاد ہیں کہ ان میں تطبیق ہو ہی نہیں سکتی۔ اور چونکہ فقہ کا مدار آیات سے زیادہ روایات پر ہے، اس وجہ سے اس میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں اور مسائل میں بیحد اختلافات ہو گئے ہیں۔

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے جا کر یہی سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جا کر دریافت کیا، بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہاء ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں راویوں کا اسقدر اختلاف! اب دوبارہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں، مجھے تو حدیث ملی ہے:

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع وشرط یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انھوں نے کہا کہ حدثنی ھشام عن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لانفسھم فقال رسول اللہ ما کان

[1] موضوعات کبیر ص ۱۶۔

من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولاء ان کی رہے گی۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن نمیر کے پاس آیا انھوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیرا و شرطت لی حملانہ الی المدینۃ۔ یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلافات پر ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

خاتمہ ان تمام بیانات کو جو حقائق پر مبنی ہیں، دیکھنے کے بعد ہر سوچنے اور سمجھنے والا شخص اس حتمی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ قرآن دین کی مستقل کتاب ہے اور اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ہدایت کیلئے کافی ہے۔ وہ انسانی عقل کے سامنے ہر شعبۂ حیات میں اتنی روشنی رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کے نور میں اللہ کی مرضی کے مطابق کام کر سکے۔ باقی رہی حدیث اور فقہ، سو حدیث کا صحیح مقام "دینی تاریخ" ہے اور فقہ کا "ہنگامی اجماع یا قیاس"۔

لاہور میں

طلوعِ اسلام کی سول ایجنسی

مکتبہ جدید چوک انارکلی

کے پاس ہے

لہٰذا مقامی ایجنٹ پرچے ان سے حاصل کریں

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

"ناقابلِ فراموش انقلاب

جس نے اقوامِ عالم (کے قلب) پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کر دیا"

گبن

ان الفاظ میں اس انقلاب کا تذکرہ کرتا ہے — جسے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کیا

اس ناقابلِ فراموش انقلاب کی روح پرور داستان کا حامل قرآن ہے۔

اس داستانِ انقلاب کو

جناب پرویز کے حقیقت نگار قلم نے اردو میں پیش کیا ہے۔

معراجِ انسانیت {معارف القرآن جلد چہارم}

میں اس داستان کو ملاحظہ کیجئے۔

قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک علاوہ

انبیائے سابقہ کی دعواتِ انقلاب

کو بھی اسی طرح جناب پرویز نے قرآن ہی کے ماخذ سے

تاریخِ رسالت {معارف القرآن جلد سوم}

کے نام سے پیش کیا ہے۔

قیمت پندرہ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ

ادارہ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

قرآن کا مصرف

(مولوی کے نزدیک)

جس شخص کے قلب سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاع ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو وہ جب خدائے حی وقیوم کی کتاب زندہ کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت وجلال کے سامنے تھر تھرا اٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطۂ خداوندی کی شوکت وسطوت کے پیش نظر اس کے بربط ہستی کے ہر تار میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جب تدبر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو زندگی کے حقائق ایک ایک کر کے اس کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے مصنف سے لگایا جا سکتا ہے تو اس کتاب حکیم کی بلندی منزلت کا کیا پوچھنا جس کا مصنف خود خدائے حکیم وخبیر ہو۔ اگر اس کی قدوسیت کا جائزہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا محمل کون ہے تو اس کتاب مقدس ومبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذات اقدس و اعظم کا قلب منور تھا جو معراج انسانیت کا مظہر اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کی قدر اس کے مشمولات سے پہچانی جاتی ہو تو اس زندہ وپائندہ کتاب کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ کہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظام کائنات سرگرم عمل ہو اور جس کے قوانین اقوام وملل عالم کی موت وحیات کے فیصلے کر رہے ہوں، اور پھر اگر اس نسخۂ تکوین حیات کی ارجمندی کی قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے جانچنی ہو تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمین عرب کے ان ذرات سے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی صحرانشین قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر وکسریٰ کی دولت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف انسانیت کے مکارم اخلاق کی ان بلندیوں تک پہنچ گئی جو آنے والوں کیلئے شرف انسانیت کا معیار قرار پا گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں ایک برقِ حفاظت تھی جو فاران کی وادیوں سے چمکی اور ہر مستبد قوت کو راکھ کا ڈھیر بنا گئی۔ ایک برہنہ شمشیر تھی جو ظلمت کدۂ عالم میں چمکی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ پھینک گئی جس نے انسانیت کو غیر فطری بندشوں میں جکڑ رکھا تھا۔ سچ فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ

نقش قرآں تا درین عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثل حق پنہاں وہم پیداست او — زندہ وپائندہ وگویا است او

یہ تھی خدائے حی وقیوم کی وہ کتاب زندہ و پائندہ جس پر قرنِ اول کے مسلمانوں نے عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ قومیں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے سے کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہیں، لیکن اس کے بعد اس کتاب مبین کے وارثوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ اسے کس طرح چیستان بنایا گیا؟ اس سے (معاذ اللہ) کیا کیا کھیل کھیلے گئے؟ کس طرح اس کا مقصود محض یہ قرار دیا گیا کہ "ثواب" کی خاطر اس کے الفاظ کو دہرا دینا اور پھر اس "ثواب" کو مردوں تک پہنچاتے رہنا چاہیئے؟ کس طرح اس کا استعمال یہ بتایا گیا کہ اس کی آیات بینات کو کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر گلے میں ڈال لینا چاہیئے، اس کی مقدس سورتوں کو پڑھ کر جھاڑ پھونک کرنی چاہیئے۔ غرضیکہ جو کچھ یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں نے اپنے ہاں کی افسانہ طرازیوں اور توہم پرستیوں کے ساتھ کیا تھا وہ سب کچھ اس ضابطہ قوانین الٰہیہ کے ساتھ کیا گیا اور آج بھی یہی کچھ کیا جا رہا ہے۔ اور تاسف بالائے تاسف کہ یہ سب کچھ جہلا کے طبقے میں نہیں ہو رہا بلکہ ان لوگوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے جو اپنے آپ کو عالم (صاحبان علم) کہتے ہیں۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس تمام چیستان طرازی اور توہم پرستی کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کہ جن کی بعثت دنیا سے ہر قسم کی توہم پرستی کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔

کراچی سے ایک رسالہ شائع ہوتا ہے "صحیفہ الحدیث"، اس میں "احسن التفاسیر" کے نام سے قرآن کریم کی تفسیر بطور ضمیمہ مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ دیکھئے کہ اس تفسیر میں کیا لکھا ہے! یہ مفسر قرآن فرماتے ہیں:

> یوں تو ہر بیماری و مرض کا علاج بذریعہ دم، جھاڑ اور تعویذات شرعیہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے۔ چنانچہ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کی عادت مبارک تھی کہ ہر بیماری کا علاج خدا کے بتائے ہوئے دم جھاڑوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ . . . مگر بچھو کی نیش زنی اور سانپ وغیرہ زہریلے جانوروں کے اثر سمی سے بچنے کیلئے آپ نے ایک خاص استعاذہ اور بڑی مفید دوا بتلائی ہے۔ . . . چنانچہ آپ نے فرمایا جو شخص شام کے وقت آیت قرآنی سلام علی نوح فی العالمین کو پڑھے گا اس کو بچھو نہیں کاٹے گا۔ . . . ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دفعہ نبی علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے مسجد میں۔ آپ کی انگشت مبارک پر ایک بچھو نے کاٹ کھایا، سلام پھیر کر آپ نے فرمایا، بچھو پر خدا کی لعنت ہو، نبی کو بھی بغیر کاٹے نہیں چھوڑا۔ پھر آپ نے پانی اور نمک ملا کر وہاں مل دیا اور سورۂ اخلاص و معوذتین پڑھ کر دم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آرام کر دیا۔ اس کے بعد اس تفسیر میں لکھا ہے کہ یہی تعویذ یا دیگر ادعیہ ماثورہ لکھ کر بچوں کے گلے میں بھی ڈال سکتے ہیں، چنانچہ تفسیر غرائب القرآن اور غائب الفرقان میں ہے کہ امام باقر رضی اللہ عنہ سے بچوں کے گلے میں تعویذ باندھنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کی اجازت دی۔

یہ ہے ٹھیٹھ اہل حدیث جماعت کے نزدیک قرآن کریم کا مصرف۔ اب ذرا ان سے نیچے اتر کر ان کی طرف آیئے جو فقہ حدیث کے

بن بن چلتے ہیں اور جنھیں دیوبندی حضرات کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اہلِ حدیث اور دیوبندی حضرات مسلمانوں کی بری رسوم و بدعات کو مٹانے کے سب سے بڑے داعی ہیں اور دیوبند کا مدرسہ نہ صرف مولوی حضرات کا مرکز تھا بلکہ وہاں ہر سال سینکڑوں مولوی تیار بھی کئے جاتے تھے۔ وہاں سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا تھا جس کا نام تھا "خالد" معلوم نہیں کہ یہ رسالہ اب بھی شائع ہوتا ہے یا نہیں۔ اس رسالہ کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا "خالد بن ولید سیفٌ من سیوف اللہ"۔ اس میں ایک بزرگ کی کتاب "عطار النشان" کا ترجمہ مسلسل اقساط میں شائع ہوتا تھا۔ اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات مقدسہ کے متعلق مختلف وظائف، اعمال تعویذات، گنڈہ، جھاڑ پھونک ٹوٹکے درج ہوتے تھے اور بڑے بڑے بزرگان کبار مثلاً امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ رفیع الدینؒ وغیرہم کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ اس میں سے چند ایک مثالیں سنئے:

۱) فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان سورہ مزمل اکتالیس بار چالیس روز بلا ناغہ پڑھئے۔ بعد چلہ کے اللہ تعالیٰ چالیس روپیہ اس کو دیگا۔ (اس کے ساتھ ہی مصنف کتاب نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک بات انھیں غیب سے القا ہوئی تھی اور وہ یہ تھی کہ) سات روز تک نفلی روزے رکھے اور سات دن جھوٹ بالکل نہ بولے اور روزانہ بعد نماز عشاء آیہ کریمہ وعندہ مفاتح الغیب ایک ہزار مرتبہ پڑھے۔ اول و آخر درود شریف گیارہ گیارہ بار پڑھے، پھر یا حی ایکہزار مرتبہ اور یا قیوم ایک سو پچاس مرتبہ۔ بعد ایک ہفتہ کے ایک جنیہ نورانیہ یعنی اس عمل کی موکلہ حاضر ہوگی۔ اس سے پانچ صد یا ہزار روپیہ سالانہ اپنی جیب میں رکھ لے اور خرچ کرتا رہے۔ روزانہ خرچ کے بعد بھی ڈیڑھ سو روپیہ بچے رہیں گے بفضلہ تعالیٰ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ عمل بعض عامل دیارِ مغرب سے حاصل ہوا۔

سنتے ہیں کہ آجکل بعض اکابر مدرسہ دیوبند اور ان کے متوسلین اور معتقدین پاکستان میں دیوبند کے انداز کا دارالعلوم قائم کرنے کی فکر میں ہیں لیکن اس کے لئے روپیہ کی دقت ہے۔ انھیں چاہئے کہ در بدر جھولیاں پھیلانے کی بجائے اس وظیفہ کو شروع کریں۔ تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ بلکہ حکومت کے محکمہ مہاجرین کو بھی چاہئے کہ وہ ہر مہاجر سے یہ وظیفہ شروع کرا دے کہ مہاجرین کا مسئلہ دنوں میں حل ہو جائے گا۔

۲) پھر اس کتاب میں لکھا تھا کہ اگر تم چاہو کہ تم میں اور دوسرے شخص میں محبت اور عشق پیدا ہو تو پانی کا برتن لیکر اس میں سے ایک گھونٹ پیو پھر بعد دم سات مرتبہ پھونک کر اپنے پانی پر دم کردو۔ پھر ایک گھونٹ پانی اس میں سے لیکر منہ میں پھراؤ اور اس برتن میں کلی کردو، جو شخص بھی اس پانی میں سے پئے گا تم سے محبت کریگا۔

واضح رہے کہ ہم یہ اقتباسات لالہ گردھاری لال کی مشہور عالم جنتری سے نہیں پیش کر رہے، دارالعلوم دیوبند کے آرگن ماہنامہ "خالد" سے نقل کر رہے ہیں۔

۳) بکری کا بایاں بازو گوشت کا سالم دست لے بعد نماز جمعہ تنہا مکان میں ننگا مادرزاد ہو کر اس دست پر سورۂ یٰسین معہ نام طالب و مطلوب کے جس قدر لکھی جاسکے لکھے پھر ایک ہانڈی میں رکھ کر چولھے کے نیچے دفن کردے کہ گرم رہے اور جلے نہیں مطلوب کا دل طالب کے عشق میں بے قرار ہوگا۔ اگر جل جائیگا تو طالب کو سوزش پیدا ہوگی، احتیاط شرط ہے عمل مجرب ہے۔

۴) منقول از امام غزالیؒ۔ الف سے طا تک نو حروف مفردات ابجد ایک روٹی پر لکھے اور اس پر سورۂ رعد پڑھے پھر اس کے پانچ ٹکڑے کرکے پانچ کتوں کو کھلائے۔ کھلاتے وقت کہے کھاؤ گوشت فلاں بن فلاں کا اور اس کے اعضا چباڈالو۔ اللہ کے حکم سے دشمن کے جسم میں بڑے بڑے پھوڑے نکلیں گے اور اس کا بدن پھوٹ نکلے گا۔

۵) ایک نقش اسمائے کہف کا درج ہے جس کے دوران میں فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت مولنا گنگوہی کے خاندانی عمل سے اس طرح حاصل ہوا، الٰہی بحرمت یملیخا، مکسلمینا، کشفوطط، کشافطیونس، تبرنس، اذرفطیرفی، یوانس پولس وکلبہم قطمیرو علی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر ولوشاء لھدا کم اجمعین۔ فقط

ایک عمل ایسا مفید اور دلچسپ ہے کہ آپ اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، تحریر ہے:

۶) اگر کوئی شے گم ہوجائے اور چرانے والے کا پتہ نہ چلے تو چاہیئے کہ انگشت پر دس مرتبہ درود شریف پڑھے اور اپنی ران پر سے اور چالیس بار ان اسماء کو استرے پر دم کرکے ران کے بال مونڈے۔ خودبخود چور کے سر کے بال منڈھ جائیں گے عجیب عمل ہے بسم اللہ علیقہ ملیقہ تلیقہ تلیقہ بحق لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وعلی ولی اللہ (فائدہ) بقول مولوی نظام الدین کیرانوی مرحوم برائے اجرائے حاضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے۔

دیکھئے محکمہ پولیس کی مشکلات کس قدر آسان ہوگئیں کسی تفتیش کی ضرورت ہی نہیں۔ جہاں چوری ہوئی یہ عمل کیا اور چور کا سر منڈھ گیا۔

۷) اسی ضمن میں ایک اور عمل بھی تحریر ہے۔ لیموں کے پتے لاکر ہر پتہ پر یہ آیت اور شخص مشتبہ کا نام اس کے نیچے لکھے اور آگ میں ڈالے جو چور ہوگا اس کے پیٹ میں درد ہوگا اور وہ آیت ہے۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما . . . . الخ

۸) ایک عمل چہل کاف کے متعلق درج ہے جس کی نسبت تحریر ہے کہ یہ عمل بالاتفاق سب کے نزدیک الہامی ہے اور منسوب ہے حضرت غوث الاعظم میراں محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف۔ الحمدللہ اولاً وآخراً۔ اس عمل کی متعدد خاصیتیں درج ہیں۔ منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ درازیٔ عمر کیلئے سات سات دن کے بعد سات مرتبہ کنگھی پر دم کرکے ڈاڑھی میں کرے۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آپ یہ پڑھ کر ہنس رہے ہوں گے لیکن ہم یہ لکھ رہے ہیں اور شدت غم سے اپنے آنسو نہیں تھام سکتے کہ ہمارے نزدیک کسی قوم کی بدبختی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ اس کے ہاں خدا کی زندہ و پائندہ کتاب کے ساتھ یہ مذاق ہو رہا ہے اور ہو رہا ہو اس جگہ جو ان کے دینی علوم کا مرکز کہلائے۔ جس دینی علوم کے مرکز میں یہ کچھ ہوتا تھا اسی کے دوبارہ احیاء کی کوششیں

اب پاکستان میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اگر آپ ذرا بہ نگاہ تعمق دیکھیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سب کی تہ میں وہی ایک جذبہ کارفرما ہے جسے شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ باتیں متقدمین کی طرف منسوب چلی آتی ہیں اس لئے متاخرین آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ کر کورانہ تقلید میں جکڑے انہی چیزوں کو دین بنائے بیٹھے ہیں اور انہی کی نشر و اشاعت اپنا فریضہ مذہبی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ اعمال و وظائف بڑے بڑے بزرگان کرام کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی اس میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ حضورؐ کی طرف جن عملیات اور جھاڑ پھونک کو منسوب کیا گیا ہے اس کا نمونہ شروع میں صحیفہ اہل حدیث کراچی سے پیش کیا جا چکا ہے۔ سحر اور ٹونکوں کے موثر ہونے کیلئے خود بخاری شریف میں ایک روایت اس طرح درج ہے:

عن عائشۃ قالت سحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی کان یخیل الیہ انہ یفعل الشئ وما یفعلہ حتی کان ذات یوم دعا ودعا ثم قال اشعرت ان اللہ قد افتانی فیما فیہ شفائی اتانی رجلان فقعد احدھما عند راسی والآخر عند رجلی فقال احدھما للآخر ما وجع الرجل قال مطبوب قال ومن طبہ قال لبید بن الاعصم قال فیما ذا قال فی مشط ومشاقۃ وجف طلعۃ ذکر قال فاین ھو قال فی بئر ذروان فخرج الیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم رجع فقال لعائشۃ حین رجع نخلھا کانہ رؤس الشیاطین فقلت استخرجتہ فقال لا اما انا فقد شفانی اللہ وخشیت ان یثیر ذالک علی الناس شرا ثم دفنت البئر۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے جادو کر دیا تو آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ نہ کئے ہوئے کام کو خیال فرماتے کہ میں کر چکا ہوں کہ ایک روز آپ نے مکرر سہ کرر دعا فرمائی اور پھر فرمایا کہ عائشہ تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج مجھ کو ایسی چیز بتائی کہ جس میں میری شفا ہے یعنی میرے پاس دو شخص آئے ایک پائنتی بیٹھ گیا اور ایک سرہانے۔ ایک نے دوسرے سے کہا اس شخص کو کیا مرض ہے دوسرے نے کہا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ پہلے نے کہا کس نے جادو کیا ہے اس نے جواب دیا لبید ابن اعصم یہودی نے۔ پہلا بولا کس چیز میں کیا ہے دوسرے نے کہا کہ کنگھی میں اور روئی کے گالوں میں اور کھجور کے چھلکے پر۔ پہلے نے کہا وہ کہاں ہے۔ دوسرے نے کہا، ذروان کے کنویں میں ہے۔ اس کے بعد حضورؐ کنویں کے پاس تشریف لائے اور جب واپس ہو کر آ گئے فرمایا میں نے دیکھا کہ وہاں کی کھجوریں ایسی ہیں جیسے شیطان کے سر۔ میں نے عرض کیا آپ نے جادو کی چیز کو بھی نکلوا دیا۔ فرمایا نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو شفا بخش دی ہے میں نے یہ خیال کر کے کہ کوئی اور شر پیدا نہ ہو، اس کنوئیں کو بند کر دیا۔

مولوی صاحبان کے نزدیک قرآن کا دوسرا مصرف ہے داستان گوئی اور افسانہ طرازی۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کی تفسیر میں صرف قرآن کے حقائق اور اس کے قوانین ہی بیان کئے جائیں تو وعظ میں لطف پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے زیب داستان کی غرض سے مولوی صاحبان اپنے وعظ میں ایسی ایسی دلچسپ کہانیاں بیان کرتے ہیں کہ جن سے داستان امیر حمزہ بھی شرمائے اور طلسم ہوشربا بھی ماند پڑ جائے۔ ان داستانوں سے ہماری کتب تفاسیر بھری پڑی ہیں۔ لیکن آپ کو تفاسیر کی بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست 'پاکستان' کے ریڈیو نے بفضلہ تعالیٰ آپ کے لئے یہ کام بہت آسان کر دیا ہے۔ اللہ توفیق دے تو صبح آٹھ بجے ریڈیو کھولئے اور اس قسم کی داستانیں مزے لے لے کر سنئے۔ لطف اور ثواب دونوں حاصل کیجئے۔ فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ، ان داستانوں کا نمونہ یہ ہے:

۱۰ ستمبر (اتوار) تفسیر سورہ بروج کے ضمن میں ارشاد ہوا:

ان آیات کے متعلق مفسرین نے مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ ایک بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں ایک جادوگر تھا۔ اس جادوگر نے اپنے آخری وقت میں بادشاہ سے کہا کہ اسے ایسا ذہین لڑکا دیدیا جائے جسے وہ اپنا علم سکھا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ ہی اس کا علم بھی ختم ہو جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے اسے ایک ذہین لڑکا دیدیا۔ اس لڑکے کے راستہ میں ایک راہب رہتا تھا۔ اس لڑکے نے مخفی طور پر راہب کا دین قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا (اس کے بعد ۱۴ ستمبر کو سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا) جادوگر اور راہب کا قصہ احادیث میں مختلف عنوانات سے پیش کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب گھر والے لڑکے سے دریافت کرتے تو کہتا کہ میں راہب کے پاس گیا تھا اور اگر جادوگر پوچھتا تو کہتا کہ میں گھر پر تھا۔ ایک دن لڑکے نے دیکھا کہ ایک شیر نے لوگوں کا راستہ روکا ہوا تھا اس نے شیر کے ایک پتھر مارا یہ سوچ کر کہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو شیر میرے پتھر سے مر جائے گا۔ پتھر کے لگنے سے شیر ہلاک ہو گیا اور اس لڑکے کی شہرت ہو گئی۔ ایک شخص جو کہ نابینا تھا اس لڑکے کے پاس آیا اور اس سے اپنی بینائی ٹھیک کرنے کی درخواست کی۔ لڑکے نے اسے بتایا کہ درحقیقت میرے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جس سے تمہاری بینائی واپس آجائے، البتہ اگر تم اپنی بینائی واپس آنے پر راہب کا دین قبول کرنے کا عہد کرو تو میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ چنانچہ اس شرط کے قبول کرنے پر لڑکے نے اس کیلئے دعا کی اور اس شخص کی بینائی لوٹ آئی۔ اللہ نے اس شخص کو بینا کر دیا۔ بادشاہ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے نابینا شخص کو، راہب کو اور لڑکے کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ بادشاہ نے نابینا شخص کو اور راہب کو تو قتل کرا دیا اور لڑکے کو عبرتناک سزا دینے کیلئے پہاڑ سے گرا کر ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ لیکن جو لوگ لڑکے کو پہاڑ پر گرانے کیلئے لے کر گئے وہ سب خود گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا بچ گیا۔ دوبارہ اس لڑکے کو پانی میں غرق کرنے کی

کوشش کی گئی لیکن غرق کرنے والے خود غرق ہو گئے۔ یہاں تک کہ لڑکے ہی نے بتایا کہ تیر پر بسم اللہ لرب الغلام پڑھ کر چھوڑنے سے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اور اس طرح اس لڑکے کو بادشاہ نے ہلاک کرا دیا۔ لیکن لڑکے کی ہلاکت کے باوجود عوام نے طے کیا کہ وہ اس لڑکے کے دین پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ بہت لوگ اس لڑکے کے دین پر لانے کے جرم میں خندقیں[1] کھود کر اور ان میں آگ جلا کر ہلاک کئے گئے۔

یہ نمونہ ہے قرآن پاک کی اس تفسیر کا جو ہر صبح ریڈیو پاکستان کی وساطت سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلائی جاتی ہے۔ اس قرآن کی تفسیر جس کے متعلق ہم ساری دنیا سے کہتے ہیں کہ جن مصائب اور مشکلات سے دنیا اس وقت دوچار ہے اور جن کا حل دنیا کے ارباب فکر و تدبر کے بس کی بات نہیں، ان کا واحد اور مکمل حل قرآن کریم کے اندر ہے۔ یہ ہے وہ دعویٰ جسے ہم بڑے فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کا ثبوت اس قسم کی تفسیروں سے دیتے ہیں۔ پہلے یہ تفسیریں ہماری کتابوں کے اندر محبوس تھیں اور ان کا دائرہ سماعت وعظ کی مجلسوں کی چار دیواری تک محدود۔ لیکن اب جو ہیں اللہ نے نشر و اشاعت کے وسائل عطا فرمائے ہیں تو اس کی کتاب مبین کے یہ "حقائق و معارف" دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلائے جا رہے ہیں تاکہ انھیں یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو کہ ہمارا صحیح مقام کیا ہے۔

مولوی صاحبان کا ایک اور طبقہ ہے جو اپنے آپ کو ماڈرن ظاہر کرتا ہے۔ اسلامی جماعت کے حضرات اس طبقہ کے علمبردار ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے لٹریچر کا کوئی صفحہ اور ان کے وعظوں کا کوئی ٹکڑہ ایسا نہ ہوگا جس میں "کتاب و سنت" "کتاب و سنت" کو دہرایا نہ گیا ہو۔ لیکن ان کی عملی حالت یہ ہے کہ ان سے کوئی بات پوچھئے اس کے جواب میں وہ فقہ، تفسیر، روایات کے حوالے پر حوالے دیتے چلے جائیں گے، لیکن اس میں اگر کسی چیز کی کوئی سند نہ ہوگی تو وہ خدا کی کتاب ہوگی۔ شاید آپ نے اس سے پہلے اس پر غور نہ کیا ہو لیکن اس کے بعد اس چیز کو سامنے رکھ کر ان کے لٹریچر کو پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں قرآن کس طرح سے غائب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی جماعت کے نقیب "ترجمان القرآن" کی تازہ ترین (نومبر ۱۹۵۰ء کی) اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کے اصولی احکام"۔ ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے اور یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ جزئی نہیں اس کے اصولی احکام ضرور قرآن میں موجود ہوں گے۔ اس بائیس صفحہ کے مضمون میں جو مودودی صاحب، امین احسن صاحب اصلاحی اور عبدالغفار حسن صاحب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، نیل الاوطار، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ترمذی، دارقطنی، بیہقی،

---

[1] سورۂ بروج میں ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (خندق والے ہلاک ہو گئے) یہ واقعہ لفظ خندق کی نسبت سے وضع ہوئی اور قرآن کریم کے حقائق و معارف کا جزو بن گئی۔ مولوی حضرات کی تفسیر قرآن اسی ٹائپ کی ہوا کرتی ہے۔

کتاب الاموال، موطا، ابوداؤد، محلی، عطا، مجاہد، ابن سیرین، زہری، امام مالک، امام شافعی، ابن قدامہ، امام محمد، سلیمان ندوی (تصانیف و مصنفین) کے اقتباسات اور حوالے جا بجا ملیں گے لیکن مصارف زکوۃ کے علاوہ قرآن کریم کی طرف صرف دو یا تین بار رجوع کیا گیا ہے اور وہ بھی محض ضمناً۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلامی جماعت کے اسی آرگن میں اس چیز کو بصراحت لکھا گیا ہے کہ قرآن کے علاوہ خدا کی طرف سے مثلہٗ معہٗ (قرآن کے ہم پایہ، قرآن کے ساتھ) روایات بھی نازل کی گئیں۔ پھر ان روایات کی بنا پر فقہ مرتب ہوئی۔ اب ان حضرات کے نزدیک خدا کی طرف سے نازل شدہ شریعت روایات اور فقہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ قرآن کریم کو جیسا کچھ سمجھا جاتا تھا وہ ان روایات و فقہ میں آچکا ہے، لہٰذا قرآن اب (معاذ اللہ) بیکار شے ہے۔ اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کی یٰسین سے دم آسانی سے نکلتا ہے اور اس کے ایصال ثواب سے مردہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ باقی رہے زندگی کے مسائل سو ان کا حل روایات اور فقہ میں موجود ہے، یعنی ان حضرات کے نزدیک خدا اس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ انسانوں کی مکمل راہنمائی کر سکے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اس قابل نہیں تھا کہ مکمل راہنمائی دے سکے بلکہ اس نے جو احکام نازل کئے وہ اس قابل ہی نہیں تھے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ ان میں سے کئی احکام ایسے تھے جنھیں روایات و فقہ کے ذریعہ سے منسوخ کرنا پڑا۔ بعض احکام ایسے تھے جو قرآن میں درج ہونے سے رہ گئے۔ یہ کمی بھی روایات نے پوری کی۔ لہٰذا اب امت روایات و فقہ کی تو محتاج ہے، قرآن کی محتاج نہیں۔

اگر کہیں ایسا موقع پڑ جائے کہ ان لوگوں کے لئے قرآن کا حوالہ ناگزیر ہو جائے تو اس وقت یہ جس دیدہ دلیری سے قرآن کو جوڑ توڑ کر اپنی منشا کے مطابق بنا لیتے ہیں اس کی مثال اہل کتاب کی تحریف کتب میں بھی کم ملے گی۔ مثلاً جماعت اسلامی نے ایک اصول وضع کیا ہے کہ جو شخص کسی منصب کیلئے خود امیدوار ہو اسے وہ منصب نہ دیا جائے۔ اس "مستقل اصول" کا مدار احادیث پر ہے لیکن مودودی صاحب نے اس دعوی کی تائید میں قرآن سے بھی استناد کی کوشش فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

قرآن میں صاف فرمایا گیا ہے:

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين۔ (القصص)

وہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) تو ہم ان لوگوں کیلئے رکھیں گے جو زمین میں خود اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں، اور عاقبت صرف خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔

پہلے اس آیت کے ترجمہ میں تحریف ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کے الفاظ ہیں لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا جس کا ترجمہ ہے: وہ نہیں چاہتے (لا یریدون) علوا (اس لفظ کا ترجمہ بعد میں دیں گے) زمین میں (فی الارض) ولا فسادا (اور نہ فساد) یعنی وہ لوگ جو زمین میں علو اور فساد نہیں چاہتے۔ مودودی صاحب کے ترجمہ کے مطابق "علو" کا ترجمہ "بڑائی" ہے لہٰذا ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہوگا،

وہ لوگ جو زمین میں بڑائی اور فساد نہیں چاہتے۔

مودودی صاحب اصول یہ بیان فرما رہے تھے کہ جو لوگ کسی منصب کے لئے خود امیدوار ہوں (یعنی جو لوگ اپنی بڑائی آپ چاہیں) انہیں وہ منصب نہ دیا جائے۔ اس کیلئے انہوں نے قرآن کی آیت میں "خود اپنی" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا اور قرآن کی آیت کا ترجمہ یہ لکھ دیا:

جو زمین میں خود اپنی بڑائی نہیں چاہتے۔

اب اس ترجمہ سے آپ امیدوار بننے کا مفہوم نکل آیا اور مودودی صاحب کی امت مطمئن ہو گئی کہ ہاں ہمارے امیر نے جو اصول بیان فرمایا ہے اس کیلئے قرآن میں حکم موجود ہے۔

یہ تو رہا ترجمہ میں اضافہ کے متعلق۔ اب اس آیت کے صحیح مفہوم کو لیجئے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ آخرت کا گھر ان لوگوں کیلئے ہے جو زمین میں علو اور فساد نہیں چاہتے۔ "فساد" کا مطلب صاف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں "علو" سے کیا مفہوم ہے۔ اس مفہوم کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ خود اسی سورۂ قصص میں جس کی آیت زیر نظر ہے، قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ

ان فرعون علا فی الارض (۲۸/۴)

شاہ ولی اللہؒ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں "ہر آئینہ فرعون تکبر کرد در زمین"۔ شاہ رفیع الدینؒ صاحب لکھتے ہیں "تحقیق فرعون نے تکبر کیا تھا زمین میں"، اور مولانا اشرف علیؒ صاحب اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: "فرعون سرزمین مصر میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا"۔ سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں یہودیوں کے متعلق لکھا ہے:

لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا۔

شاہ ولی اللہؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں "ملغیان خواہید کرد بسرکشی بزرگ"۔ یعنی علو کا ترجمہ سرکشی ہے۔ اسی طرح سورہ یونس میں فرعون کے متعلق ہے لعالٍ فی الارض (۱۰/۸۳) (وہ ملک میں سرکش ہو گیا تھا)۔ سورہ مومنون میں پوری قوم فرعون کے متعلق لکھا ہے: وکانوا قوما عالین کہ وہ سرکش قوم تھی۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے علوا فی الارض کے معنی ملک میں سرکشی اختیار کرنا ہیں۔ لہذا سورہ قصص کی زیر نظر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا:

وہ آخرت کا گھر ان لوگوں کیلئے ہے جو نہ تو زمین میں سرکشی اختیار کرتے ہیں، نہ فساد برپا کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ آیت جو مودودی صاحب اس "مستقل اصول" کی تائید میں پیش فرما رہے ہیں کہ جو شخص کسی منصب کیلئے خود امیدوار ہو اسے از روئے قرآن اس منصب سے محروم رکھنا چاہئے۔ (واضح رہے کہ ہم اس اصول کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر رہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یا تو یہ قرآن کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے اور اگر کبھی قرآن کی طرف آنا بھی پڑتا ہے تو

قرآن کو اپنی منشاء کے مطابق تبدیل کر لیتے ہیں اور اس تبدیلی کی کھلی ہوئی مثال مودودی صاحب کا یہ کارنامہ ہے۔ ہم مودودی صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ سارے قرآن سے لا یریدون علواً فی الارض کا مفہوم " خود اپنی بڑائی نہیں چاہتے " نکال کر دکھائیں۔ وان لن تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارۃ ۔

یہ ہے مولوی صاحبان کے نزدیک قرآن کا مصرف اور اس کا مقام۔ ان کے برعکس کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اس لئے نازل کیا کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ زندگی بن سکے۔ یہ قرآن ہر دور اور ہر نسل کے انسانوں کے لئے مکمل راہنمائی اپنے اندر رکھتا ہے۔ آج نوعِ انسانی جن مسائل سے دوچار ہے قرآن ان مسائل کا حل بھی دیتا ہے اور یہ حل قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتے۔ انسانی فکر جن بلندیوں تک بھی چاہے چلا جائے لیکن قرآن اس سے آگے رہے گا، اور جب تک وہ فکر قرآن کے پیچھے پیچھے چلتا رہے گا نوعِ انسانی صحیح راستہ پر گامزن رہے گی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قرآن کی اطاعت کا حکم تھا حضورؐ نے اسی قرآن کی اطاعت سے اپنے دور کیلئے نظامِ زندگی تشکیل فرمایا۔ لہٰذا اسی قرآن کی اطاعت سے آج بھی نظامِ زندگی تشکیل کرنا خدا کے حکم اور رسول اللہ صلعم کے عین مطابق ہے۔

لیکن اس دعوے سے مولوی صاحبان کا خود ساختہ مذہب بیکار ہو جاتا ہے اور چونکہ انھوں نے کبھی قرآن پر غور نہیں کیا اس لئے ان کے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہتا۔ اس سے انکی مسند عقیدت چھٹ جاتی ہے اور منصب امامت امارت باقی نہیں رہتی۔ اسلئے وہ اس مسلک کی کبھی تائید نہیں کرتے۔ وہ اس دعوے پر فتنہ اہلِ قرآن کا لیبل چسپاں کر کے عوام کے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں (واضح رہے کہ ہم مسلمانوں کے اس فرقہ کی حمایت نہیں کر رہے جو اہلِ قرآن کے نام کو متعارف ہے۔ طلوعِ اسلام کسی فرقہ کا پیرو نہیں۔ فرقہ پرستی اس کے نزدیک شرک ہے۔ ہمیں اس سے بھی بحث نہیں کہ جنھیں اہلِ قرآن کہا جاتا ہے وہ خود ایک فرقہ بن بیٹھے تھے یا انھیں مولوی صاحبان ہی نے زبردستی ایک فرقہ بنا دیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو طلوعِ اسلام کو کسی فرقہ سے کوئی واسطہ نہیں۔) مولوی صاحبان اس دعویٰ کے مدعیوں کو اہلِ قرآن قرار دیکر بہت خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے انھیں سیدھا جہنم میں دھکیل دیا اور کبھی نہیں سوچتے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اہلِ قرآن (قرآن پر ایمان رکھنے والے اور قرآن کی اتباع کرنے والے) تھے۔ پھر یہی حضرات اس روایت کو بھی پیش کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جنھوں نے حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے) کہا تھا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر یہ روایت بھی ان کی طرف سے آتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے وفات کے بعد جب حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ نے کیا چھوڑا ہے تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ مابین دفتین (قرآن کریم) ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز امت کو نہیں دی۔ حضورؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں فرمایا۔ نہ ہی اسے امت کو دیا۔ طلوعِ اسلام اسی دعوت کا مبلغ ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی۔ احادیث کا مجموعہ، تاریخ و سیر کی دوسری کتابیں فقہ کے مجموعے بزرگانِ امت کی تصانیف ہماری علمی متاع ہیں۔ ہم ان سے مستفید ہوں گے، لیکن صرف قرآن کی روشنی میں۔ پھر قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے اس لئے وہی دین میں یقینی حجت ہے۔ وذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۔

باب المراسلات

۱۔ قرآن کریم کی حفاظت طلوع اسلام کی ستمبر کی اشاعت میں ہم نے ایک صاحب کے استفسار کے جواب میں تفصیلاً لکھا تھا کہ جو قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا تھا وہی قرآن ہمارے پاس حرفاً حرفاً بغیر کسی تغیر و تبدل کے موجود ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم نے قرآن کریم کی وہ داخلی شہادت پیش کی تھی جس کی رو سے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ پر لی ہے اور خارجی شہادت کے طور پر ہم نے یہ لکھا تھا کہ غیر مسلم مورخین کی تحقیقات اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت بھی دنیا میں قرآن کے ایسے نسخے موجود ہیں جو عہد صحابہ کرام میں مرتب ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں انہی صاحب نے مروان سے حسب ذیل خط ارسال فرمایا ہے:

آپ کے مؤقر مجلہ طلوع اسلام کے ماہ ستمبر کے پرچہ میں حفاظت قرآن کے سلسلہ میں اپنے سوالات کے جوابات نظر سے گذرے۔ آپ کی اس ذرہ نوازی کا ممنون ہوں۔ لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ جوابات میرے سوالات سے متعلق ہونے کے باوجود غیر متعلق ہیں۔ شاید آپ نے میری معروضات کو غور سے نہیں دیکھا یا میری تحریر اظہار مدعا کیلئے ناکافی تھی۔ بہرحال جوابات کے متعلق میری معروضات یہ ہیں:

آپ نے تمہیدی سطور میں تاریخ کے متعلق جو رائے زنی فرمائی ہے اس سے مجھے کلی طور پر اتفاق ہے لیکن حفاظت قرآن کے متعلق جن دو پہلوؤں سے آپ نے بحث کی ہے وہ محل نظر ہے۔

میرا مطالبہ قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کیلئے کسی خارجی اور قطعی دلیل کا تھا۔ لیکن آپ نے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ہ اور لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ سے استشہاد فرمایا۔ جس چیز کی قطعیت اور ثبوت کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا ہے اس کو دلیل بنا کر پیش کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ آگے چل کر تاریخ کی روشنی میں آپ نے قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حالانکہ انہی سطور میں تاریخ کے متعلق آپ کا یہ فتویٰ ہے کہ "لیکن باایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں"۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ جو چیز خود غیر قطعی ہو وہ دوسری چیز کی قطعیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے؟

طلوع اسلام - ہم اس بحث کو دوبارہ چھیڑنا ضروری نہیں سمجھتے تھے کیونکہ قرآن کے محفوظ ہونے میں کسی کو کلام ہی نہیں۔

مسلم اور غیر مسلم دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن محترم مستفسر نے اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا جواب ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآنی دعوے کا ثبوت تاریخ سے دیا ہے اور چونکہ تاریخ ایک ظنی چیز ہے اس لئے اس کی رو سے قرآنی دعوے کو یقینی طور پر ثابت شدہ کیسے مان لیا جائے۔

دعوی زیر نظر کا ثبوت طلب کرنے والے یا مسلمان ہو سکتے ہیں یا غیر مسلم۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے قرآن اور تاریخ کے باہمی تعلق کی پوزیشن یہ ہے کہ

۱) قرآن کا ہر دعوی یقینی ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

۲) اس ایمان کی بنا پر تاریخ کی وہ شہادتیں جو قرآن کے دعووں کی تائید کرتی ہیں، قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

۳) جو تاریخی شہادتیں قرآن کے خلاف جائیں گی وہ مسترد کر دی جائیں گی۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں غرق ہوا تھا اس کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی۔ ایک عرصہ تک تاریخ نہ صرف فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے ہی کے خلاف تھی بلکہ اکثر مورخین ساری کی ساری داستان بنی اسرائیل ہی سے انکار کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اسے ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ حضرت یوسفؑ کبھی مصر گئے، یا مصر میں قحط پڑا اور اس کا انسداد حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ ہم تاریخ کی ان تمام شہادتوں کو ناقابل قبول قرار دیتے تھے اس لئے کہ یہ قرآن کے خلاف تھیں۔ ہم کہتے تھے کہ ہنوز تاریخی انکشافات تاتمام ہیں، یقینی انکشافات قرآن کے دعووں کی تصدیق کریں گے۔ بعد میں مصر کی اثری تحقیقات کا زمانہ آیا اور زمین نے اپنے سینہ میں دبی ہوئی یادگاروں کو اس انداز سے اگلا کہ قرآن کے ایک دعوی کی تصدیق مجسم پیکروں کی شکل میں سامنے آگئی۔ یہی حال ہماری اپنے ہاں کی تاریخ کا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خدا کے سچے نبی تھے اور کوئی نبی جھوٹا نہیں ہوتا۔ بخاری میں اس قسم کی حدیثیں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی ایسا کہ جس کے احساس سے وہ خدا کے سامنے جانے سے شرمائیں گے۔ ہم بہ حیثیت مسلمان ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کرنے کیلئے تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا یا یہ کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا فرمایا تھا۔ ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ تاریخی شہادت غیر یقینی ہے اور لہٰذا ناقابل قبول۔ اس کے برعکس جن احادیث میں حضرات انبیائے کرامؑ کی صداقت اور نبی اکرم صلعم کے خلق عظیم کے واقعات مندرج ہیں، وہ سب قابل قبول ہیں اور ہم انھیں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ قرآن کریم میں یہ دعوی ہے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی، لہٰذا ہر وہ تاریخی شہادت جو حفاظت قرآن کی تائید میں ہوگی ہمارے نزدیک قابل قبول ہوگی، اور ہر وہ شہادت جو اس کے خلاف جائے گی رد کر دی جائے گی۔ خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعوی حقیقت ثابتہ ہے اور تاریخ ظنی۔ محترم مستفسر کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہوا ہے کہ چونکہ تاریخ ظنی ہے

اس لئے اس کی تائید سے قرآن کے دعووں کی صداقت تسلیم نہیں کی جاسکتی تو یہ کھٹکا ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن کے دعووں کی صحت وسقم کا مدار تاریخی شہادات پر ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن کا ہر دعویٰ اپنی جگہ سچا ہے اور اپنی سچائی کے لئے کسی تاریخی شہادت کا محتاج نہیں۔ اگر تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے تو اس سے وہ اپنی سچائی کی دلیل لاسکتی ہے، اور اگر وہ اس کے خلاف جاتی ہے تو قرآن کا دعویٰ اپنی جگہ پر سچا رہے گا۔ تاریخی شہادت سے کہا جائے گا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کرے۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسلک تو سائنٹفک اصول کے خلاف ہے کہ جو چیز قرآنی دعویٰ کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھ لیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے لیکن جو چیزیں ایمانیات میں داخل ہیں ان کیلئے یہی اصول سچا اور سائنٹفک ہے۔ اس ایمان کی رو سے تاریخی شہادتوں کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنی دعوے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا ایمان نہیں رکھتے وہ غیر مسلم ہیں اور ان کا معاملہ ہم سے الگ ہے۔ ان کے پاس چونکہ حق اور باطل کا کوئی مستقل، محکم، غیر متبدل، خارجی (Objective) معیار نہیں اس لئے وہ تاریخ کی شہادتوں کو اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہی پرکھ سکتے ہیں۔ اگر ان کے اصولوں کے مطابق کوئی تاریخی شہادت معتبر سمجھی جاتی ہے اور وہ قرآن سے ٹکراتی ہے تو انھیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تاریخی شہادت کو معتبر سمجھیں۔ البتہ جب ہم ان سے گفتگو کریں گے تو ہم یا تو یہ ثابت کریں گے کہ ان کے اصولوں میں سقم ہے یا ان کی تحقیقات میں نقص۔

لیکن حفاظتِ قرآن کے معاملہ میں تو یہ صورت پیش نہیں آرہی۔ اس کی تائید تو ان کے اصولوں کے مطابق مرتب کردہ تاریخی شہادات بھی کر رہی ہیں۔

۲۔ حرمتِ شراب | ایک صاحب رقمطراز ہیں:

قرآن شریف میں شراب کے متعلق لفظ حرام کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اکثر ان حضرات سے گفتگو ہوئی جو اسکی "حمایت" میں ہوئے تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر شراب کو حرام کرنا مقصود ہوتا تو جیسا کہ زنا، سود اور مردار وغیرہ کے لئے صاف صاف کہدیا گیا ہے اس کیلئے بھی صاف لفظ حرام استعمال ہوتا۔ بلکہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ "اس میں فائدے بھی ہیں لیکن نقصانات فائدوں سے زیادہ ہیں، اس لئے تم پرہیز کرو" لفظ پرہیز کی تفسیر علماء نے "حرام" کی ہے۔

مہربانی فرما کر آپ اس کی وضاحت کیجئے کہ قرآن کے ان الفاظ کا کیا مفہوم لیا جائے۔

طلوعِ اسلام قرآن کریم میں (سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۹۱-۹۰) شراب (خمر) کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ "رجسٌ من عمل الشیطٰن" اور اس کے بعد ہے فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ اس کے بعد ہے کہ شیطان اس کے ذریعہ چاہتا ہے کہ تم میں بغض اور عداوت پیدا ہو جائے، تم ذکر اللہ اور الصلوٰۃ سے رک جاؤ، اور اس کے بعد ہے فھل انتم منتھون۔ اس سے ظاہر ہو کہ قرآن نے شراب کو

۱) ناپاک کہا ہے۔

۲) شیطانی عمل قرار دیا ہے۔

۳) مانع فلاح و بہبود ٹھہرایا ہے۔

۴) باہمی عداوت اور بغض کا موجب قرار دیا ہے۔

۵) الصلوٰۃ اور ذکر اللہ کی راہ میں مسدود کرنے والی بتایا ہے۔

اور ۶) اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا شراب کے بارے میں خدا کا منشاء اور اس کا حکم معلوم کرنے کیلئے اس سے زیادہ اور وضاحت کی بھی ضرورت ہے؟ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی جو شخص شراب پیتا ہے وہ اگر خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے اور جو شخص خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور شیطانی عمل کا اتباع تو اسے آپ حزب اللہ (خدا کی پارٹی) میں شامل کرینگے یا حزب الشیطان (شیطان کی پارٹی) میں؟ واضح رہے کہ قرآن نے ان دو پارٹیوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دیا ہے۔ کیا شراب کی ممانعت کیلئے یہ تصریحات کافی نہیں؟ لفظ حرام کی بحث تو ذرا آگے چل کر آئے گی، یہاں اتنا سمجھ رکھئے کہ کسی کام سے اجتناب کا حکم تو ایک طرف رہا جن چیزوں کے متعلق اللہ نے کہا ہے کہ لا تقربوھا (ان کے قریب مت جاؤ) ان کاموں کا کرنے والا بھی قانونِ خداوندی کی رو سے مجرم اور انھیں جائز سمجھنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

اب رہا یہ کہ قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، بعض کے متعلق کہا ہے کہ وہ اثم ہیں، عدوان ہیں، بعض کے متعلق کہا ہے کہ ان سے مجتنب رہو وغیر ذلک، تو اس امتیاز کا مطلب کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قانون کی رو سے مختلف جرموں کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات قانونی سزاؤں کے متعلق ہیں۔ جب اسلامی قانون کو مرتب کیا جائے تو اس وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ فلاں جرم کو قرآن نے کس درجہ میں رکھا ہے اسی درجہ کے مطابق اس کی سزا مقرر کی جائیگی۔

سزا کا فلسفہ ایک اہم موضوع ہے اور مفصل گفتگو کا محتاج جس کیلئے نہ یہ محل مناسب ہے اور نہ سردست گنجائش۔ لیکن مختصراً اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مختلف جرائم کا ایک اثر تو معاشرہ پر پڑتا ہے اور ایک انسانی سیرت پر۔ جہاں تک معاشری اثرات کا تعلق ہے اس کیلئے قانون میں سزائیں تجویز کی جاتی ہیں لیکن جہاں تک ان اثرات کا تعلق ہے جو خود سیرتِ انسانی پر مترتب

ہوتے ہیں وہ ان سزاؤں سے زائل نہیں ہوتے۔ ان کے زائل کرنے کے اور طریقے ہیں۔ وہ طریقے بھی قانونِ خداوندی میں مذکور ہیں اور ان میں "باطنیت" کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ لیکن بہرحال وہ طریقے الگ ہیں۔ اگر کسی معاشرہ میں کسی ایسے عمل کو جرم نہیں قرار دیا گیا جس سے قرآن نے روکا ہے تو اس فعل کا مرتکب معاشرتی سزا سے تو بچ جائے گا لیکن جو اثر اس کی سیرت پر مترتب ہوا ہے اس سے وہ کسی حالت میں بچ نہیں سکتا کہ یہ اثرات قانون مکافاتِ عمل کے ماتحت مترتب ہوتے ہیں اور وہ قانون اٹل اور غیر متبدل ہے۔ یہی کیفیت حسنِ عمل کی ہے۔ ایک تو ان کے وہ خوشگوار نتائج ہیں جو معاشرہ میں نمودار ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا اثر انسانی سیرت پر مترتب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جس معاشرہ کا نظام اسلامی ہوگا اس میں کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس کا اثر صرف انسانی سیرت پر مترتب ہو اور اس کے خوشگوار نتائج معاشرہ میں نمودار نہ ہوں۔ اسلامی نظام میں انسان کی داخلی اور خارجی بالیدگیاں ساتھ ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

اعمال کی جزا کے یہی دو پہلو ہیں جنھیں قرآن نے نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ بعض جگہ وہ کہتا ہے جزاء بما کانوا تعملون یعنی تمہارے اعمال کا بدلہ۔ اس سے مفہوم ہے اعمال کے وہ نتائج جو خارجی طور پر مترتب ہوتے ہیں، اور وہ کہیں کہتا ہے جزاء بما کانوا تعملون یعنی وہ اعمال جو اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری روزمرہ کی دنیا میں دیکھئے ہم کسی شخص کو کسی ایسی جگہ بھیجتے ہیں جو دو میل کے فاصلہ پر ہے، اس کے معاوضہ میں اسے ایک روپیہ دیتے ہیں۔ اس کیلئے اس دو میل کے سفر میں اپنا کوئی مقصد نہیں۔ اس کے اس عمل کا معاوضہ وہ روپیہ ہے جو ہم نے اسے دیا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص صبح کو سیر کیلئے جاتا ہے اور دو میل کا چکر کاٹ کر واپس آتا ہے تاکہ اس کی صحت ٹھیک رہے۔ اس کیلئے یہ دو میل کا سفر اپنی جزا آپ ہے۔

یہ چند باتیں محض سرسری طور پر سمجھانے کی خاطر لکھ دی گئی ہیں، ورنہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے جزا اور سزا کا فلسفہ یعنی قرآنی قانون مکافاتِ عمل ایک الگ موضوع ہے، تفصیل طلب۔

بہرحال جہاں تک اس بات کا تعلق ہے جس کے متعلق پوچھا گیا ہے، اس کے متعلق پھر سمجھ لیجئے کہ ہر وہ شے جس سے باز رہنے کا حکم قرآن میں دیدیا ہے، خواہ اس کے لئے الفاظ کوئی بھی استعمال کیوں نہ کئے گئے ہوں، اس کا ارتکاب خدا کی معصیت (نافرمانبرداری) ہے اور اسے جائز سمجھنا یا یہ سمجھنا کہ اس سے کچھ حرج واقع نہیں ہوتا، خدا کے قانون سے انکار ہے۔ اور خدا کے قانون سے انکار کا نام کفر ہے۔

باقی رہا یہ کہ قرآن نے خمر اور میسرہ (شراب اور قمار بازی) کے متعلق کہا ہے کہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں اور اثم بھی۔ لیکن ان کا اثم ان کے نفع سے زیادہ ہے۔ تو اس سے بعض لوگ یہ دلیل لایا کرتے ہیں کہ شراب یا قمار بازی اس حالت میں ناجائز ہے جب ان کا نقصان ان کے نفع سے بڑھ جائے۔ لیکن اگر ان کا نفع ان کے نقصان پر غالب رہے تو ان میں کوئی حرج نہیں۔ سو واضح ہو

کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ شراب کے نقصانات سے بچو۔ اس نے کہا کہ شراب سے مجتنب رہو یعنی اس نے یہ چیز بطور ایک امر واقعہ کے بیان کی ہے کہ ان چیزوں میں فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ تم ایسا انداز اختیار کرو کہ جس سے فائدے ہی فائدے ہوں نقصان نہ ہو، یا نقصان ہو تو کم۔ اس نے کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں کچھ فائدے بھی ہیں لیکن یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کے نقصان بہرنوع و بہرحال فائدوں سے زیادہ ہیں۔ اور اس کے بعد مستقل طور پر یہ حکم دیدیا کہ ان سے اجتناب کرو، یہ شیطانی اعمال ہیں۔ اس لئے قرآن کا حکم یہی رہا کہ یہ شیطانی اعمال ہیں ان سے بچو۔ یہ نہیں کہ ان کے نقصانات سے بچو۔

چونکہ ایک بات سامنے آگئی ہے اس لئے جی نہیں چاہتا کہ اسے چھوڑ کر سلسلۂ کلام ختم کر دیا جائے۔ قرآن نے کہا ہے کہ خمر اور میسر میں "اثم کبیر" ہے۔ اثم کے معنی غور طلب ہیں، اسلام نام ہے اس جماعتی زندگی کا جس میں افراد ملت ایک دوسرے سے ہم آہنگ، باہوں میں باہیں ڈال کر، قدم ملاتے ہوئے جانب منزل رواں دواں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا، واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ اے افراد جمعیۃ اسلامیہ خود ثابت قدم رہو اور ربط باہمی سے دوسروں کی ثابت قدمی کا ذریعہ بنو اور اس طرح سب مل کر ایک منظم طریقہ سے قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرو تاکہ تمہاری محنتیں بارآور ہوں۔) لہٰذا اس نظام میں جماعت سے الگ ہو جانا جرم عظیم ہے۔ "تسالم" کے معنی گھوڑوں کا باہمی قدم ملا کر چلنا ہے۔ جماعت کی صف سے الگ ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا نظم و ضبط (قانون خداوندی) سے سرکشی اختیار کر کے آگے نکل جانا۔ اسے "عدوان" کہتے ہیں۔ یا ضعف و ناتوانی، سستی اور کاہلی، گراں باری اور زمین گیری، تساہل اور تکاسل کی وجہ سے پیچھے رہ جانا۔ اسے اثم کہا جاتا ہے۔ "اثمہ" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تساہل اور تکاسل یا ضعف و اضمحلال کی وجہ سے قافلہ سے پیچھے رہ جائے۔

خمر ہر اس شے کو کہتے ہیں جو قوائے عقلیہ کو مضمحل کر دے (خمر اس چادر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو ڈھانپ دے) اور میسر ہر وہ مال ہے جو بلا محنت اور مشقت آسانی (یُسر) سے ہاتھ آجائے، اور اس طرح انسان کے قوائے عملیہ کو معطل کر دے۔ لہٰذا خمر اور میسر کا لازمی نتیجہ قوائے عقلیہ اور عملیہ میں ضعف اور اضمحلال ہے جس کی وجہ سے انسان جماعتی نظام کے ساتھ نہیں چل سکتا، پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس زندگی کو قرآن نے مترفین کی زندگی کہا ہے اور مترفین کی جو خصوصیات قرآن نے بیان کی ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے قوائے عقلیہ اس درجہ مفلوج ہو چکے ہوں کہ وہ حقائق پر غور کرنے کی بجائے تقلیدی روش ہی کو محفوظ مسلک سمجھیں، اور جن کے قوائے عملیہ اس طرح معطل ہو چکے ہوں کہ وہ دوسروں کی کمائی پر گزارہ کریں۔ بہرحال یہ ایک ضمنی چیز تھی جو سامنے آگئی اور جس کی طرف محض چند اشارات کر دیئے گئے۔ ورنہ یہ اجمال خود ایک بڑی تفصیل کا متقاضی ہے

دستورِ پاکستان

طلوعِ اسلام کی نومبر کی اشاعت میں دستورِ پاکستان سے متعلق جو مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ اسے اس حلقہ کے علاوہ جو طلوعِ اسلام سے مستقل دلچسپی رکھتا ہے ملک کے ایسے گوشوں تک بھی پہنچا دیا جائے جو اس موضوع کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم منتظر رہے کہ اس کے متعلق ردِ عمل کا جائزہ لیں۔ اکثر حضرات کی طرف سے جن کی اصابتِ فکر اور صحتِ نظر کے ہم ہمیشہ معترف رہے ہیں، اس سے حرف بحرف اتفاق کیا اور ہماری اس کوشش ناتمام کو نیک فال سے تعبیر کیا۔ اس سے ہمیں خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ لیکن اس موافقت سے کہیں زیادہ ہم یہ دیکھنے کے لئے مضطرب تھے کہ ہماری گذارشات سے اختلاف کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو اختلاف نہیں بلکہ مخالفت کہئے۔ غالب نے تو کہا تھا کہ۔ ہمیں تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ ہے کہ جن کی یہ خو ہو چکی ہے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام میں شائع ہو اس کی مخالفت کی جائے۔ ان لوگوں کے متعلق کئی بار یہ تجربہ کیا گیا کہ جب ان کے سامنے کوئی بات پیش کی گئی اور یہ نہ بتایا گیا کہ کہنے والا کون ہے تو انھوں نے اس کی صحت اور صداقت کا اعتراف کیا لیکن جس چیز کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ کہنے والا کون ہے تو انھوں نے بغیر سوچے سمجھے (اور بعض اوقات بغیر دیکھے) مخالفت شروع کر دی۔ لہٰذا یہ طبقہ ہمارے نزدیک عام طور پر درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا، اگرچہ ہم ان کی تحریروں کا بھی بغائر مطالعہ کرتے ہیں کہ شاید ان میں کوئی اعتراض معقول بھی ہو۔

اس وقت تک ہماری نظر سے کوئی اعتراض نہیں گزرا۔ البتہ کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ ایوننگ ٹائمز کے Diarist نے اپنی ۳۰ نومبر کی اشاعت میں طلوعِ اسلام کا ذکر بالعموم اور مقالہ زیرِ بحث کا تذکرہ بالخصوص کیا ہے۔ اس میں طلوعِ اسلام کی خدمات کو سراہا گیا ہے اور اہلِ فکر طبقہ سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس پرچہ کا مطالعہ ضرور کیا کریں۔ اس کے بعد دستورِ پاکستان سے متعلق طلوعِ اسلام کے مقالہ کا ذکر ہے اور اس ضمن میں لکھا ہے:

> مفصل تبصرہ کی تو گنجائش نہیں لیکن اس مقالہ میں ایک چیز ایسی ہے جو میرے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔۔۔۔۔
>
> طلوعِ اسلام میں پیش کردہ قراردادِ مقاصد کی ایک شق یہ ہے کہ تمام وسائلِ پیداوار مملکت کی ملکیت ہوں گے۔
>
> یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ کمیونزم کا بنیادی اصول ہے۔ معاشی فکر میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ خیال

یہ ہے کہ اب وقت آچکا ہے کہ مارکس کے بنیادی نظریہ معاشیات پر نظر ثانی کی جائے جس میں قدر زائد (Surplus Value) کی تعبیر اور وسائل پیداوار پر حلکت کی ملکیت دونوں شامل ہونے چاہئیں۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس اصول کا جائزہ اس کے معاشرتی نتائج کی روشنی میں لینا چاہئے۔ اگر تمام وسائل پیداوار حلکت کی ملکیت ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک کے تمام وسائل پیداوار چند لوگوں کے قبضہ میں آجائیں گے جس کی بنا پر انھیں لوگوں کی موت اور حیات پر بھی اختیار حاصل ہو جائے گا۔ روس میں آج یہی کچھ ہو رہا ہے۔ چونکہ رزق کے سرچشمے شالین کے ہاتھ میں ہیں اس لئے لوگوں کی زندگی کے مقاصد بھی وہی متعین کرتا ہے۔ وہاں لوگوں کو آزادی فکر نصیب نہیں کیونکہ اس آزادی کے بدلے میں انھیں اپنی جان کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ چیز اسلام کے نصب العین کے بالکل خلاف ہے جس میں معاشرہ فرد کی نشوونما کا ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ مقصود بالذات۔

ایوننگ ٹائمز کی یہ تنقید دو ایک بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی ہے جن کا ازالہ ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ تبصرہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرارداد میں ایک شق ایسی ہے جو ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ طلوع اسلام نے اپنے مقالہ میں بار بار اس امر کو دہرایا تھا کہ اس مقالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بنیاد قرآن پر ہے اور اس کی تائید میں ہمارے پاس قرآنی دلائل موجود ہیں۔ اس کے بعد کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں بات میرے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اسے کہنا یہ چاہئے کہ فلاں بات میرے نزدیک قرآن کی رو سے درست نہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتانا چاہئے کہ وہ بات کس طرح قرآن کی رو سے درست نہیں اور اس کی بجائے کونسی قرآن کی رو سے درست ہے۔ جب مدار بحث قرآن ہو تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا کہ یہ بات میرے نزدیک قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ اگر کوئی بات قرآن کے مطابق ہے تو وہ ہمارے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو اسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ قرآن کی رو سے غلط ہے تو اسے کبھی قبول نہیں کیا جائے گا خواہ وہ ہمارے نزدیک کیسی ہی خوش آئند کیوں نہ ہو۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون۔

اس تمہید کے بعد اب اصل اعتراض پر آئیے۔ ایوننگ ٹائمز کے تبصرہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ یہ چیز کہ وسائل پیداوار حلکت کی ملکیت ہونے چاہئیں کوئی نئی بات نہیں کیونکہ یہ کمیونزم کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے۔

پہلے یہ دیکھئے کہ کسی صداقت کے صداقت ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نئی ہو اور اس سے پہلے اس کا کہیں ذکر نہ آیا ہو اگر کوئی یہ کہے کہ سچ بولنا اچھا ہے تو کیا اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے گا کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ساری دنیا ہی کہتی چلی آرہی ہے؟

اب دوسرا اعتراض لیجئے کہ یہ شق اس لئے قابلِ قبول نہیں کہ یہ کمیونزم کا بنیادی اصول ہے۔ کمیونزم نے جب مذہب کو سرمایہ داری کا آلہ کار ٹھہرایا تو اس اندھی مخالفت کے جوش میں (جسے مذہبی تعصب کا جنون کہا جاتا ہے) اس نے ان حقیقتوں کا بھی

انکار کر دیا جو دنیا میں بطور مسلمات مانی جاتی ہیں لیکن جو "بدقسمتی" سے مذہب کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ یہ کمیونزم کا جوشِ جنون تھا۔ اب یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں وہ کمیونزم کی ہر چیز کو نذر آتش کر دینے کے قابل سمجھتے ہیں خواہ وہ چیزیں ایسی کیوں نہ ہوں جن کی خود ان کے ہاں تاکید ہے۔ مثلاً جہاں کسی نے غریبوں کی ہمدردی، مفلسوں اور ناداروں کی غمگساری اور ان کے خلاف اربابِ دولت و ثروت کی قساوت و شقاوت کے متعلق دو لفظ کہے شور مچا دیا کہ یہ کمیونزم ہے۔ یہ اندازِ مخالفت بھی ایسا ہی مذموم ہے جیسا کمیونسٹوں کا جنونِ تعصب۔ دیکھنا ہمیشہ یہ چاہئے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ کیسی ہے، نہ یہ کہ وہ اس سے پہلے کس کے ہاں موجود ہے۔ اگر حق و باطل کا وہ معیار قرار پا جائے جو ہمارے تبصرہ نگار نے پیش کیا ہے تو بڑی مشکل پیش آجائے گی۔ ہم جس اخلاقی ضابطہ کو بھی پیش کریں گے، ہوسکتا ہے کہ اس کی کوئی شق دہریوں کے ہاں بھی رائج ملے، اور کوئی شق مشرکین کے ہاں، کوئی یہود کے ہاں، کوئی مجوس کے، کوئی نصاریٰ کے، کوئی ہنود کے، کوئی نظامِ سرمایہ داری ہیں، کوئی کسی آمرانہ مملکت میں۔ اس معیار کے مطابق یہ تمام شقیں ناقابلِ قبول قرار پا جائیں گی، اور آپ کو کوئی ایسا ضابطہ وضع کرنا پڑے گا جس کی کوئی شق کہیں اور نہ ملے۔

ہمارے تبصرہ نگار کا اعتراض یہ ہے کہ اگر وسائلِ پیداوار مملکت کی ملکیت میں دیدیئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ

۱) رزق کے سرچشمے مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں آجائیں گے۔

۲) یہ لوگ انہی سرچشموں کے بل بوتے پر عوام کی موت و حیات تک اپنے قبضہ میں لے آئیں گے، اور

۳) ایسی صورت میں حریتِ فکر مفقود ہو جائے گی۔

پہلے شق (۱) کو لیجئے۔ ہمارے تبصرہ نگار نے مملکت اور حکومت میں فرق نہیں سمجھا۔ مملکت کے مٹھی بھر لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کے مروجہ نظاموں کے مطابق زمامِ اقتدار ہوتی ہے، انہیں "حکومت" کہا جاتا ہے نہ کہ مملکت۔ طلوعِ اسلام میں حکومت اور مملکت کے اس بنیادی فرق کے متعلق کئی بار تصریح کی جا چکی ہے۔ اب رہا یہ کہ جب طلوعِ اسلام نے لکھا ہے کہ قرآن کی رو سے ملک کے تمام وسائلِ پیداوار مملکت کی مشترکہ ملکیت ہونے چاہئیں نہ کہ افراد کی تو اس میں "مملکت" سے کیا مفہوم ہے۔ قرآن نے مملکت کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ اس کی بجائے اس نے امت (People) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ طلوعِ اسلام نے کھلے الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی تھی کہ اسلامی نظام میں مملکت سے مراد پوری کی پوری ملت ہے۔ چنانچہ مقالہ زیر بحث کے صفحہ ۴ پر یہ عبارت درج ہے:۔

> قرارداد مقاصد میں یہ لکھا ہے کہ خدا نے اپنے اختیارات ملت (People) کی وساطت سے مملکت کو عطا کئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اختیارات کی حامل مملکت ہے، ملت نہیں۔ کسی نظامِ مملکت میں ملت اور مملکت (People and the State) کے کیا تعلقات ہیں؟ یہ بحث ایک زمانہ سے علمائے سیاست (Political Science) کی بحث و تمحیص کا مرکز بنے چلی آرہی ہے۔ مغربی مفکرین میں سے میکیاؤلی، لاک، روسو، ہابز، منتھم، مل،

وغیرہ نے اس مسئلہ پر بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے۔ ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مطالعہ قرآن کی رو سے اسلام میں ملت اور مملکت الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ملت ایک انتظامی مشینری متعین کرتی ہے جو خود ملت ہی کا ایک جزو ہوتی ہے۔ ملت اپنے اختیارات اس انتظامی مشینری کو تفویض نہیں کر دیتی۔ اختیارات ملت ہی کے ہوتے ہیں ان کا استعمال اس مشینری کی وساطت سے ہوتا ہے۔ قرآن کی رو سے اصل بحث ملت اور مملکت کی نہیں بلکہ فرد اور ملت کے باہمی تعلق کی ہوتی ہے۔ فرد (Individual) اور مملکت (State) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے متعلق بھی مغرب کے علمائے سیاست نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہمیں اس بحث سے بھی سردست واسطہ نہیں۔ قرآن کی رو سے ملت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر فرد کی فطری صلاحیتوں کی تکمیل کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع بہم پہنچائے (اسی کو نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔) اور فرد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی استعدادوں کا حاصل ملت کے سپرد کر دے تاکہ اس سے یہ نظامِ ربوبیت قائم رہے۔ واضح رہے کہ یہ نظامِ ربوبیت تمام نوعِ انسانی کو محیط ہوتا ہے یعنی اس کی ابتدا اگرچہ ایک متعین جماعت اور مخصوص دائرے سے ہوتی ہے لیکن یہ دائرہ پھیلتے پھیلتے تمام دنیا کو اپنے احاطہ کے اندر لے آتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ طلوعِ اسلام کے پیش کردہ دستور کی رو سے تمام وسائل پیداوار پوری کی پوری امت کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں افراد کی نہیں چہ جائیکہ وہ چند افراد کی ملکیت قرار پا جائیں جن کو امت سے انتظامی امور کے لئے بطور امین منتخب کیا ہے۔ یہ امین ملت کے خادم ہوتے ہیں نہ کہ افراد کے حاکم۔ اس حقیقت کو بھی طلوعِ اسلام کے زیرِ نظر مقالہ میں واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا، چنانچہ اس کے صفحہ ۳۲ پر آپ کو یہ عبارت نظر آئیگی:

انسانیت کے بنیادی حقوق کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ لیکن جب ہم اسے اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہ مسئلہ بہت آسان اور سادہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی مملکت میں دو قسم کے افراد ہوں گے۔ ایک مسلم دوسرے غیر مسلم۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مسلم جماعت نظامِ اسلامی کے قیام و استحکام کی ذمہ دار ہوگی۔ واضح رہے کہ اسلامی نظامِ مملکت میں انسانوں کی حکومت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ وہاں صرف معاملات کے انتظام کا سوال ہوتا ہے[1]۔ اس میں تو ملت اور اس نظام میں ایک معاہدہ (Contract) ہوتا ہے جس کی رو سے ملت کا ہر فرد اپنی دیہی اور اکتسابی ملکیتیں (جان، اور سب کچھ جو جان سے متعلق ہے اور مال اور ہر شے جو مال کے ضمن میں آسکتی ہے) سب کچھ اس نظام کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین اموالہم وانفسہم بان لہم الجنۃ اور اس کے مقابلہ میں یہ نظامِ ربوبیت اس کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ ملت کیلئے جنت مہیا کر دیگا۔ جنت کی تفاصیل سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ انسان کی طبعی

[1] "Not Government of men but the administration of things."

ضروریات سے لیکر اس کی انسانیت کے نشوونما تک کونسی چیز ایسی ہے کہ جو جنت کی تفصیل میں نہیں آجاتی۔
اس طرح یہ نظام افراد ملت کے لئے وہ سب کچھ مہیا کرتا ہے جس کی رو سے ان کی دنیاوی زندگی بھی خوشگواریوں سے بھر جاتی ہے اور اس زندگی کے بعد کی زندگی بھی طیبات سے معمور ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس نظام میں حاکم اور محکوم کا تصور ہی نہیں اس میں یہ سمجھنا کہ "ارباب حکومت" شاہین بن جائیں گے اور افراد امت کی جان اور مال سب ان کے قبضہ میں ہوگی، اسلامی نظام کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ اسلامی نظام کی ایک شق کو لیتے ہیں اور اسے دنیا کے موجودہ نظاموں میں رکھ کر سوچتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ چاقو کی نفع رسانی اور مضرت کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے چاقو کو بچے کے ہاتھ میں نہ دیکھئے۔ بچے کے ہاتھ میں دیئے ہوئے چاقو کے متعلق آپ کی رائے چاقو کی بجائے بچے کے متعلق ہوتی ہے۔ اسلامی نظام ایک ہیئت کلی کا نام ہے جس کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ پرزے کی افادیت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب وہ مشین میں اپنے صحیح مقام پر فٹ ہو۔ اسلامی نظام صرف خارجی دنیا کے لئے قانون ہی نہیں دیتا بلکہ انسان کی داخلی دنیا میں صحیح توازن پیدا کرتا ہے جس سے اس کے اندرونی تضادات میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور خارجی ماحول بھی عدل و احسان کے توازن بدوش انقلاب کا مظہر بن جاتا ہے۔ اگر انسانی سیرت میں یہ انقلاب نہ ہو تو چھوٹی سے چھوٹی قوت بھی دشمن حریت فکر اور رہزن ایمان و آگہی بن جاتی ہے۔ اور اگر انسانی سیرت مستقل اقدار (پیمانوں) کے مطابق ڈھلی ہو تو بڑی سے بڑی قوت بھی شمشیر کی بجائے سپر بن جاتی ہے۔

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

اسلامی نظام میں رزق کے سرچشمے ربوبیت عامہ کے لئے وقف اور مخصوص ہوتے ہیں، اس لئے ان سے کوئی شخص شاہین اور بٹلر بھی بن سکتا۔ غیر اسلامی نظام میں یہی سرچشمے چند افراد یا خاص طبقات کی ہوس رانیوں اور کام جوئیوں کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لئے ان کا عمومی نظام بھی جسد انسانیت کیلئے جذام ہوگا۔ اسلامی نظام میں کوئی فرد کسی فرد یا کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقہ کے لئے مقاصد زندگی متعین نہیں کرتا۔ اس نظام میں پوری کی پوری ملت کے لئے مقاصد پہلے سے متعین شدہ ہوتے ہیں اور امیر المومنین سے لے کے ایک عام فرد تک ہر شخص ان مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے مصروف سعی و عمل رہتا ہے اور جب یہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں تو یہ کامیابی امیر المومنین کی نہیں ہوتی بلکہ پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے۔

فٹ بال کے میچ میں ٹیم کا کپتان ٹیم کے افراد کیلئے مقصد متعین کرتا ہے نہ ان کی سعی و عمل کی سمت۔ وہ صرف تقسیم عمل کرتا ہے اور باقی افراد کے ساتھ ایک ڈیوٹی اپنے ذمہ بھی لیتا ہے۔ یہی صورت اسلامی نظام میں ارباب حل وعقد اور افرادِ امت کی ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں بھی طلوعِ اسلام کے زیرِ نظر مقالہ میں بصراحت موجود تھیں لیکن حیرت ہے کہ وہ تمام ایوننگ ٹائمز کے تبصرہ نگار کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

آخر میں تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ اسلامی نظام میں معاشرہ فرد کی نشوونما کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ چیز طلوعِ اسلام کے زیرِ نظر مقالہ میں شاید پچاس مرتبہ دہرائی گئی تھی لیکن ہم محترم تبصرہ نگار سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں ہوں تو اسلامی معاشرہ کے پاس کیا ہوگا جس کے ذریعہ سے وہ افراد کی نشوونما کا انتظام کر سکے گا۔ افراد کی نشوونما ہی کیلئے تو ضروری ہے کہ معاشرہ کے پاس سامانِ نشوونما موجود ہو۔

یہ تھا وہ اعتراض جو طلوعِ اسلام کے پیش کردہ تصورِ دستور کے خلاف اس وقت تک ہماری نگاہ سے گذرا ہے۔ یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ خبر ملی کہ مجلس دستور ساز نے فیصلہ کر دیا ہے کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث و مذاکرہ سردست ملتوی کر دیا جائے اور قوم سے کہا جائے کہ وہ اس رپورٹ کے متعلق اپنے اعتراضات، ترمیمات یا متبادل سفارشات ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء تک اسمبلی کے پاس بھیج تاکہ ان سفارشات پر مزید غور و خوض کیا جائے۔ یہ فیصلہ نتائجِ حسنہ کا پیامبر ہو سکتا تھا لیکن دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کے پیشِ نظر ہم اس باب میں زیادہ پرامید نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ تمام تنقیدات اور سفارشات قرارداد مقاصد کے اصولوں کے مطابق ہوں۔ یعنی قرارداد مقاصد کو وحی الٰہی تصور کر لیا گیا ہے جس میں کوئی سقم اور سہو نہیں۔ وہ ابدی حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا انسانی فکر و نظر کی تمام گردشیں اس محور کے گرد گھومنی چاہئیں۔ لیکن جیسا کہ ہم اپنے مقالہ محولہ صدر میں بصراحت بیان کر چکے ہیں خود قرارداد مقاصد ہی اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خشتِ بنیاد پر جو دیوار بھی اٹھے گی ٹیڑھی یا کج رہے گی۔ قرارداد مقاصد بھی انہی انسانوں کی مرتب کردہ تھی جنہوں نے دستوری سفارشات مدون کی ہیں۔ اگر دستوری سفارشات محلِ نظر ہو سکتی ہیں تو قرارداد مقاصد تنقید کی حد سے کیوں بالا قرار دی جا رہی ہے۔ قوم کی طرف سے مطالبہ ہونا چاہئے کہ قرارداد مقاصد کو بھی قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے جس اسمبلی نے اسے قبول کیا تھا وہی اسمبلی اس پر دوبارہ غور بھی کر سکتی ہے۔

دوسری چیز وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ ہمارے ارباب بست و کشاد نے (عوام کی رو سے متاثر ہو کر) یہ فرض کر لیا ہے کہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے دستوری سفارشات کو پرکھنے کا حق مولوی صاحبان کو ہی حاصل ہے۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی کہ مولوی صاحبان کسی چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر متفق اللسان نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کی طرف سے پیش کردہ سفارشات اختلافات و تضادات کا انبار ہوں گے۔ اس کے بعد مجلس دستور ساز اپنی بے بسی ظاہر کر دے گی اور جو کچھ موجودہ کمیٹی کی سفارشات میں تجویز کیا گیا ہے، کم و بیش وہی کچھ آئین بن جائے گا (راستے میں پنجاب کے انتخابات کا سیل تشویش انگیز بھی غالباً گذر چکا ہوگا)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے گذارش کیا تھا کہ اگر ہمارے ذمہ دار حضرات فی الواقعہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور منشائے خداوندی کے مطابق مرتب ہو جائے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس امر کا فیصلہ کر دیا جائے کہ اس دستور کے اصولوں کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ اس کے بعد قوم کے ارباب فکر و نظر سے کہا جائے کہ وہ دستوری خاکے مرتب کریں لیکن اپنی پیش کردہ ہر شق کی تائید میں قرآن کی سند پیش کریں۔ اس طرح سے جو خاکے سامنے آئیں گے ان میں جزئی اختلافات کا امکان ہو سکتا ہے لیکن یہ اختلاف بآسانی دور کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ ان کی سند تو ایک ہوگی۔ لیکن اگر آپ اسلامی نظام کے دستور کے اسناد (Authorities) ایک سے زیادہ تسلیم کر لیں تو ان اختلافات کا مٹنا ناممکن ہے۔ امت میں تیرہ سو برس سے جو اختلافات چلے آرہے ہیں ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین کی سند خدائے واحد کے بجائے یا اس کے علاوہ اور گوشوں کو بھی ٹھہرا رکھا ہے۔ یہ تمام گوشے ان کے نزدیک مستقل سند اور حجت رکھتے ہیں۔ اس لئے کوئی شخص اپنی سند یا حجت کے مقابلہ میں دوسرے کی سند یا حجت کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتا۔ کوئی اہلحدیث فقہ حنفی کو سند اور حجت نہیں تسلیم کر سکتا۔ وقس علیٰ ہذا۔ آپ خالص قرآن کو سند تسلیم کر کے تجربہ کر دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے دستوری خاکے میں بہت کم اختلافات ہوں گے اور جو ہوں گے وہ ایسے کہ تھوڑی سی افہام و تفہیم کے بعد ان میں موافقت کی شکل نکل آئے گی۔

ایک متفقہ علیہ اسلامی نظام کے مرتب کرنے کی یہی ایک شکل ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں خواہ آپ راجہ غضنفر علی صاحب کی تجویز کے مطابق پاکستان کو چھوڑ کر ساری دنیا کے علمائے کرام کو بھی اکٹھا کیوں نہ کر لیں۔ اگر یہ اکٹھے ہو سکتے تو آج ساری دنیا ہی پاکستان کیوں نہ ہوتی۔ بات صرف ذرا ہمت سے کام لینے کی ہے۔ اگر ہمت سے کام لیا گیا تو نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے ہی سرفرازی اور سربلندی کی راہیں کشادہ ہو جائیں گی بلکہ پوری کی پوری دنیا نئے سرے سے انسانیت شرف انسانیت سے بہرہ یاب ہو جائے گی اور ہم ایک دفعہ پھر سے سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے کہ

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

جمہوریت

مسلمانوں کے لائق مزدکیت ہے نہ فغفوری ۔۔۔ وہ ہے اللہ سے دُوری یہ انسانوں سے مہجوری

کمالِ آدمیت منحصر ہے حسنِ سیرت پر ۔۔۔ کہ معیارِ شرف سرمایہ داری ہے نہ مزدوری

بھلا وحی و رسالت کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ۔۔۔ جو ہوتی عقل ہی سے زندگی کی رہبری پوری

بنا اسلام کی احکامِ قرآنی پہ قائم ہے ۔۔۔ یہاں نا معتبر ہے قلت و کثرت کی منظوری

مسلماں کیلئے قرآں ہے سرچشمۂ قوت ۔۔۔ نہ ہو کیوں ضعف اُتنا جسقدر قرآں سے ہے دوری

نہیں اربابِ باطل بہرہ ور فیضِ رسالت سے ۔۔۔ نہ روشن اُن پر اپنے دیدۂ باطن کی بے نوری

تعجب ہے مگر ملت کی اس ذہنی غلامی پر ۔۔۔ کہ ہم از خود کریں جو اور کرتے ہیں بہ مجبوری

وہ عقلِ عام پر مبنی ہے یہ وحیٔ الٰہی پر

کجا آئینِ اسلامی کجا دستورِ جمہوری

اسعد ملتانی

مُلکِ خداداد کا تصوّر

اقبالؒ کے نزدیک

علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں اپنے مختلف تصورات کو مختلف طرق و اسالیب سے پیش کیا ہے۔ کہیں مکالمات کی شکل میں، کہیں مشاہیر سلف کے ارواح کی زبان سے، کہیں کسی مقام کی کیفیات کا نقشہ کھینچکر، کہیں خود اپنے واردات کے خط و خال بیان کر کے۔ ایک مقام پر انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جب دنیا میں آئینِ خداوندی کے مطابق نظام معاشرت قائم ہوگا تو اس وقت خطۂ ارض کی حالت کیا ہو جائے گی۔ انھوں نے اس خطے کے مثالی بیان کے لئے فلکِ مریخ میں مرغدین کا شہر منتخب کیا ہے جسے وہ "ملکِ خداداد" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش شکل، نرم طبع، سادہ پوش۔ تسخیرِ قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (Energy) سرچشمۂ حرارت (آفتاب) سے براہِ راست حاصل کرنے والے۔

فکرِ شان بے دردِ و سوزِ اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور — چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد نوعِ انسانی کی خدمت ہوگا نہ کہ حصولِ زر و سیم۔ بنکوں کا اس مقام پر رواج ہی نہ ہوگا۔

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کار ہا را کس نمی سنجد بزر

کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھواں دھار بنا رہی ہوں گی۔ مشینیں خدمتگذار۔ دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت۔

از طبیعت دیو ماشینیں چیرہ نیست — آسماں ہا از دخاں ہا تیرہ نیست

وہاں کا کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا۔ نہ زمیندار کی سلب و نہب (Exploitation) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا حاصل کوئی اور چھین کرلے جائے گا۔

سخت کش دہقاں، چراغش روشن است — از نہاب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو است — حاصلش بے شرکتِ غیرے اوست

چونکہ وہاں سلب و نہب (Exploitation) کا تصور ہی نہ ہوگا اس لئے باہمی مفاد کا تصادم Clash of interests) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا۔ ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ اس لئے وہاں بیکار فوجیں (Standing Army) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

اندراں عالم نہ لشکرنے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

وہاں کے اہل قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں معروف نہ ہوں گے۔

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نہ وہاں کوئی بیکار ہوگا نہ گداگر

نے بہ بازاراں نہ بے کاراں خروش — نے صدائے گدایاں در گوش

ایک شہر میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم۔ نہ کوئی کسی کا آقا نہ کوئی غلام۔ نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ تھا اقبال کے الفاظ میں، مرغدین کا نقشہ جہاں آئینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب وہاں کے حکیم نے مجھ سے کہا کہ اس جگہ نہ سائل ہوتا ہے نہ محتاج۔ نہ حاکم نہ محکوم۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ہم (مشرق کے مذہب پرست) یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ امیری اور غریبی۔ حاکمی اور محکومی، سب خدا کی طرف سے ہے۔ یہ سب باتیں تقدیر سے متعلق ہیں۔ تو یہاں یہ کیسے ہے کہ سب ایک جیسے ہیں۔ یہاں لوگوں کی تقدیریں مختلف کیوں نہیں۔ کیا تم لوگوں نے تدبیر سے تقدیر کو مٹا دیا ہے؟

سائل و محروم تقدیرِ حق است — حاکم و محکوم تقدیرِ حق است
جز خدا کس خالقِ تقدیر نیست — چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

اس کے جواب میں حکیم مرغدین نے کہا کہ تم لوگوں نے تقدیر کا مطلب ہی غلط سمجھ رکھا ہے۔ تقدیر کے معنی ہے پیمانہ۔ خدا کے ہاں مختلف پیمانے رکھے ہیں۔ جتنی ہمت تم کروگے وہ پیمانے سے ماپی جائے گی اور اس پیمانے کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائیگا۔ اس لئے اگر کوئی ایک پیمانہ تمہاری ضرورت کو پورا نہیں کرتا تو اپنی ہمت کو بڑھا لو۔ دوسرا پیمانہ مل جائے گا۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست

تم لوگوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا، کارگہِ ہستی میں انسانی ذات کے مؤثرات کو فراموش کر دیا اور سمجھ لیا کہ سب کچھ کہیں اور سے ہوتا ہے۔

ارضیاں نقدِ خودی در باختند   نکتۂ تقدیر را نشناختند

آؤ تمہیں سمجھاؤں کہ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ تقدیر سے مقصود ہے خدا کا قانون۔ جس قسم کی کوئی چیز ہوگی اسی قسم کا قانون اس پر منطبق ہو جائے گا۔ یا یوں سمجھو کہ تقدیر نام ہے کسی شے کے جوہرِ ذاتی (Intrinsic Characteristics) کا۔ جس قسم کے یہ جوہرِ ذاتی ہوں گے، اسی قسم کے خواص اس چیز سے مرتب ہوں گے۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

رمزِ باریکش بحرفے مضمر است   تو اگر دیگر شوی، او دیگر است

یہ نہ کہو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ کہو کہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے تم بن جاؤ گے، اسی قسم کا خدا کا قانون تم پر عائد ہو جائے گا۔

خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا   سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افتندگی تقدیرِ تست   قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

اگر تم تقدیر کو اس طرح سے سمجھو تو کائنات کے گنجِ گراں مایہ تمہارے قبضہ میں ہوں گے لیکن اگر تم نے تقدیر کا مفہوم وہی رکھا جو "مذہب" کے غلط تصور نے پیدا کر رکھا ہے تو اس سے محتاج، محتاج تر اور کمزور، کمزور تر ہوتا جائے گا۔

اصلِ دیں ایں است اگر اے بے خبر   می شود محتاج از و محتاج تر

یہی وہ مذہب ہے جو انسان کو سُلا دیتا ہے

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا   باز در خوابِ گراں دارد ترا

کہو یہ دین ہے یا افیون؟

سحر و افیون است یا دین است ایں   حبِ افیون است یا دین است ایں

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصور تمام فسادات کی بنیاد ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے۔

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست   مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے۔

ارضِ حق را ارضِ حق دانی بگو چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا[1]

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے "خدا کی ملکیت" میں دیدی جائے۔

کس امانت را بکارِ خود ۔ ۔ ۔ نبرد اے خوش آں کو ملکِ حق باحق سپرد

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

یہ تمام محتاجی اور غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست آنچہ از مولاست می گوئی زِ ماست

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی۔

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود این زمین و آسماں دیگر شود

یہ ہے اس نظام کا تصور جسے علامہ اقبال قرآنی نظام سمجھتے تھے۔ جاوید نامہ کے دیگر مقامات اور حضرت علامہ کی دوسری تصانیف میں اس نظام کے خط و خال بڑی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں، جنھیں کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا۔ ہماری کسقدر شوربختی ہے کہ حضرت علامہ پاکستان کا تصور تو دے سکے لیکن وہ اُس وقت ہم میں موجود نہ ہوئے جب اس کے نظام کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو پاکستان کا نظام خود مرتب فرماتے اور کسی کو اس سے مجالِ اختلاف نہ ہوتی۔ لیکن اس باب میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت علامہ کے تصورات کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن ہمارے ہاں ہر وقت زندہ ہے۔ ہم آج قرآن کی روشنی میں اپنا نظام خود مرتب کر سکتے ہیں جو وہی نتائج برآمد کرے گا جس کا نقشہ حضرت علامہ نے اپنے عالمِ تصور میں کھینچا ہے۔ یعنی

کس درین جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست[2]

اسی کی تشریح میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

---

[1] لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا۔ زمین میں خوشحالیاں پیدا ہو جانے کے بعد پھر سے ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

[2] یہ وہ دور ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ الملک یومئذ للہ۔ (۲۵/۱۹) جس دور میں خالص آئینِ خداوندی کا نفاذ ہوگا اور اس کے مطابق تمام انسانوں کے فیصلے ہوں گے (یحکم بینہم) یہ قرآنی دور ہوگا جس کی طرف دنیا خود بخود آ رہی ہے لیکن ہمارے "مذہب پرست طبقہ" نے جسے قیامت پر اٹھا رکھا ہے۔

بیماری اور اس کا علاج

کسی بیماری کے علاج کے لئے سب سے پہلی بنیادی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ علتِ مرض کے متعلق تشخیص کی جائے یعنی اس مرض کا اصلی سبب معلوم کیا جائے۔ سبب معلوم ہونے کے بعد مرض کا علاج بہت آسان ہو جاتا ہے، لیکن اگر صحیح سبب معلوم نہ کیا جائے تو پھر مرض کا علاج نہیں مریض کے ساتھ کھیلنا ہوتا ہے جس سے طبیب بدنام ہوتا ہے اور مریض ہلاک۔

جو اصول طبعی بیماریوں کے متعلق ہے وہی اصول معاشرتی امراض پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرہ میں خلفشار پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس خلفشار کا بنیادی سبب کیا ہے۔ سبب معلوم ہو جانے کے بعد اس کا ازالہ آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو خلفشار دن بدن بڑھتا رہتا ہے، افرادِ معاشرہ ارباب نظم و نسق سے تنگ آجاتے ہیں۔ اور ارباب نظم اس الجھاؤ سے پریشان ہو کر جھلا اٹھتے ہیں۔ اسی سے بدنظمی پھیلتی اور تباہی آتی ہے۔

اس وقت پاکستان کے معاشرہ میں جو خلفشار نمودار ہو چکا ہے وہ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ عوام چیخ رہے ہیں کہ حکومت ان کی شکایات کے ازالے کیلئے کچھ نہیں کرتی۔ حکومت نالاں ہے کہ قوم میں نظم اور ضبط، تعاون و تناصر اور قانون کے احترام و اطاعت کا جذبہ نہیں جس کی وجہ سے ان کی تدابیر نتیجہ خیز نہیں ہو پاتیں، دونوں ایک دوسرے کے شاکی ہیں اس لئے ان میں روز بروز بعد ہوتا چلا جا رہا ہے جو کوئی نیک فال نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علت مرض کی صحیح تشخیص نہیں کی گئی، اس لئے کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ اس وقت ملک میں تین طبقے ایسے ہیں جن کے متعلق اگر صحیح سوچ بچار سے کام لے لیا جائے تو صورت حالات بہت بڑی حد تک درست ہو سکتی ہے۔

حصول پاکستان سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک خاص طبقہ ان لوگوں کا تھا جنہیں قوم کا لیڈر کہا جاتا تھا۔ یہ کھاتے پیتے لوگ تھے، اس لئے ان کے پاس فرصت کا وقت تھا۔ مسلم لیگ نے قوم کے لئے ایک نصب العین متعین کر دیا تھا اور اس نصب العین کے حصول کے لئے تگ و تاز جاری تھی۔ لیڈروں کا یہ طبقہ اس تگ و تاز میں مصروف رہتا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ طبقہ پاکستان آگیا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے انہیں عام طور پر کوئی کام کاج آتا نہیں تھا، گذارہ کی صورت وہاں کی جائدادیں تھیں جو وہیں رہ گئیں، اس لئے یہاں آنے پر ان کے سامنے سب سے مقدم اور اہم سوال معاش کا تھا اور معاش بھی اس معیار کی جس کے یہ عادی تھے۔ اس مقصد کیلئے ان کی تگ و دو اور نقل و حرکت نے معاشرے کے سکون میں کافی اضطراب پیدا کر دیا۔ کچھ عرصہ کے

بعد مختلف انداز و طرق سے ان کی معاش کی شکلیں متعین ہو گئیں۔ اب ان میں سکون پیدا ہو جانا چاہئے تھا لیکن لیڈری میں "زندہ باد" کے نعروں کا چسکہ اس بری طرح سے لگتا ہے کہ پھر چھڑائے نہیں چھوٹتا۔ ان لوگوں کی معاش کا انتظام تو ہو گیا لیکن اس چسکے کی تسکین کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اگر مقصد قوم کی خدمت، غریبوں کی بہبودی اور مرفع الحالی ہوتا تو اس کے لئے جیسے مواقع پاکستان میں سامنے آئے تھے وہ انھیں اپنے اندر جذب کرنے کے لئے کم نہ تھے لیکن یہ لیڈری کے اس انداز سے قطعاً ناآشنا تھے۔ یہ فقط ہنگامہ پروری ہی کو لیڈری سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ نے بھی اپنے سامنے کوئی تعمیری پروگرام نہ رکھا جس میں ان لیڈروں کو طوعاً و کرہاً مصروف رہنا پڑتا۔ اس لئے ان کے سامنے اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو لیکر قوم میں ہنگامہ خیزیوں کے سامان پیدا کریں اور اس طرح "زندہ باد" کے نفس پرور نعروں سے اپنی ہوس قیادت کی تسکین کا سامان فراہم کریں۔ قوم میں موجودہ تشتت و انتشار اور اضطراب و خلفشار کا پہلا سبب لیڈروں کا یہ طبقہ ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ قوم کی بگڑی کو سنوارنے کے لئے مختلف شعبوں میں تعمیری پروگرام شروع کر دیئے جائیں اور انھیں ان کاموں میں لگا دیا جائے۔ کام اتنے ہیں کہ اگر وہ ان کے سپرد کر دیئے جائیں تو انھیں سر کھجانے کی بھی فرصت مل نہیں سکے گی۔

قوم میں موجودہ خلفشار کا دوسرا باعث مولوی صاحبان کا طبقہ ہے۔ ان حضرات کی تعلیم اس نہج پر ہوتی ہے کہ یہ اپنی روٹی کما سکنے کے قابل بالکل نہیں رہتے۔ یہ نہ کوئی ہنر جانتے تھے نہ کوئی فن۔ نچلے طبقے میں ان کے معاش کا ذریعہ مسجدوں کی امامت تھی اور اوپر کے طبقوں میں دینی مدارس کی معلمی۔ یا اس سے آگے بڑھے تو فتوحات اور نذرانے۔ تشکیل پاکستان کے بعد مسجدیں بھی ہندوستان میں رہ گئیں اور مکتب بھی۔ لیکن یہ حضرات سب کے سب ادھر آ گئے۔ یہاں جتنی مساجد یا مکتب تھے وہ پہلے ہی سے آباد تھے، اس لئے ان میں مزید کھپت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس لئے اس بیکار لشکر کے لئے معاش کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے انھیں کوئی کام نہیں آتا جس سے یہ روٹی کما کھائیں اور نذرانے اور فتوحات اتنے ہو نہیں سکتے جن سے ان سب کا پیٹ پل سکے۔ اب ظاہر ہے کہ روٹی کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی بیکار کے لئے کوئی دوسرا شخص روٹی کا انتظام نہ کرے تو اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ سوچئے ایک پورے کا پورا طبقہ جس کے پاس حصول رزق کا کوئی ذریعہ نہیں، کسب معاش کی صورت ان کے سامنے نہیں، وہ جس طریق سے اپنی معاش کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا، اس سے اگر خلفشار نہیں پیدا ہو گا تو کیا سکون پیدا ہو گا؟ اس باب میں مولوی صاحبان کی حالت قابل رحم ہے۔ اگر وہ کوئی ہنر یا فن نہیں جانتے تو یہ اس نظام تعلیم کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے اپنی عمر بسر کی تھی۔ یہ چیز تو معاشرہ کے سوچنے کی ہے کہ اس قسم کے طبقہ کے لئے کیا تجویز کی جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا حل اس سے آنکھیں بند کر لینے میں نہیں مل سکتا۔ یہ مشکل تو حل کرنے ہی سے حل ہو گی۔ ہمارا خیال ہے کہ

ان میں سے کچھ لوگوں کے لئے ایک ایسی صورت پیدا کی جا سکتی تھی جس سے ان کیلئے معاش کی صورت نکل آتی اور پاکستان کیلئے بہتری کی شکل۔ اسلامی ممالک کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ایسی بدیہی چیز ہے جس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ان ممالک کے عوام ہمارے ہاں کے عوام سے بھی زیادہ جاہل ہیں اور اس لئے مذہب کا وہ فرسودہ تصور جو مولوی صاحبان پیش کرتے ہیں، ان کیلئے باعثِ تعظیم و تکریم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ ان ممالک میں جاتے ہیں وہ عام طور پر مغربی اندازِ معاشرت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں کے عوام کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مغربی وضع قطع سے انسان کرسٹان بن جاتا ہے، اسی طرح وہاں کے عوام سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ پاکستان کے لوگوں کو فرنگی وضع قطع میں دیکھ کر یہی اندازہ لگاتے ہیں کہ پاکستان "بے دینوں" کا ملک ہے۔ وہاں مذہب کا کوئی چرچا نہیں۔ اس سے ان کے دل پاکستان سے قریب نہیں ہو سکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اسلامی ممالک میں کچھ مولوی صاحبان بھیج دیتے تو وہاں کے عوام پاکستان کو "مذہبی" ملک سمجھنے لگ جاتے اور دوسری طرف ان مولوی صاحبان کیلئے گذارے اور تعظیم کی صورت پیدا ہو جاتی۔

اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی مفید ہو سکتی تھی۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں دنیا کی سیاست کی رزمگاہ ایشیا بنے گی نہ کہ یورپ۔ ایشیا میں ایک طرف ہمارا ہمسایہ بھارت ہے جس کے عزائم استعماریت (Imperialism) ڈھکے چھپے نہیں۔ ہماری دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید ہے۔ یہاں مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی آبادی کا معتدبہ حصہ بدھوں پر مشتمل ہے۔ بدھوں کو تاریخی طور پر ہندوؤں سے عناد ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں بدھوں کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ انھیں ہندوؤں سے الگ ایک مستقل اقلیت تسلیم کیا جائے۔ بدھ ہندوستان کی برہمنیت سے کبھی رابطۂ محبت پیدا نہیں کر سکتے۔ بدبختی سے مسلمانوں نے کبھی آج تک یہ کوشش ہی نہیں کی کہ ان سے معاشرتی رابطہ پیدا کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی جو تصویر پادریوں کی وساطت سے دنیا کے سامنے پیش ہوتی رہی ہے اس کی رو سے اگر بدھ بھی مسلمانوں کو خونخوار، وحشی، غیر مہذب، ظالم، تصور کر رہے ہوں تو کچھ بعید نہیں۔ بدھوں سے معاشرتی روابط کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے قریب آجائیں گے اور اس طرح۔ ۔ ۔ ۔ ایشیا میں ایک پورے کا پورا خطہ جو آج ہم سے متنفر ہے، ہمارے متعلق اپنی رائے بدل لے گا۔ آج دنیا کی سیاست کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اقوام کو اپنے قریب لایا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ... مشرقی ایشیا کی اقوام کو اپنے قریب لانا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر ہم ان ممالک میں اپنے تبلیغی مشن نہیں بلکہ محض معاشرتی مشن پھیلا دیں تو اس سے بہتر نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس کیلئے ایسے مولوی صاحبان جو اس غرض کو اچھی طرح سے سمجھ لیں، اس کام پر متعین کئے جا سکتے ہیں۔ وہ تھوڑی سی محنت سے ان علاقوں کی زبانیں سیکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد مفید کام کر سکتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی اور تدابیر سے اس کثیر بے کار طبقہ کی معاشی مشکلات کا حل سوچا جا سکتا ہے اور اس حل سے قوم کے

موجودہ خلفشار میں بہت بڑی حد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اگر سوچنے والے طبقہ نے اس طرف توجہ نہ دی تو ملک میں لیگ کی طرح متعدد "اسلامی جماعتیں" بھی ظہور میں آجائیں گی۔ اسلامی جماعت کا مسئلہ بھی تو معاشی مسئلہ ہے۔

یہ تو رہا مولوی صاحبان کے موجودہ طبقہ کے متعلق۔ ان کے بیکار رہنے کا خطرہ مستقبل کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ انھوں نے لامحالہ یہ کوشش کرنی تھی (چنانچہ اب یہ کوشش مختلف مقامات پر کی جا رہی ہے) کہ یہاں بھی اسی قسم کے مذہبی مدارس قائم کئے جائیں جس قسم کے مدارس کی معلمی ہندوستان میں ان کے سپرد تھی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس قسم کے مدارس کے تعلیمی نصاب میں کسی ہنر اور فن کو دخل نہیں ہوتا اس لئے وہاں کے تعلیم یافتہ طالب علم سوائے امامت یا ایسے ہی مدارس کی معلمی کے اور کسی کام کے قابل نہیں ہوتے۔ اگر یہاں اس قسم کے مدارس قائم ہو گئے تو موجودہ بیکار طبقہ کے ایک حصہ کی کھپت تو ان میں ہو جائے گی لیکن یہ مدارس ہر سال ہزاروں کی تعداد میں بیکار طالب علم پیدا کرتے جائیں گے جو ملک کیلئے ایک مستقل مسئلہ بن جائیں گے۔ جہاں تک ان مدارس کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ اسے دین سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اگر اس کے ساتھ بیکاری بھی شامل ہو گئی تو اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ (ہمارے انگریزی سکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کا مسئلہ آگے چل کر آئے گا) لہٰذا ارباب حکومت کو ان باتوں کے متعلق یہ سمجھ کر بے اعتنائی نہیں برت لینی چاہئے کہ یہ مسئلہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ پاکستان کا ہر مسلمان کا مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل جو ملک کی معاشی حالت کو اس طرح سے متاثر کر رہے ہوں خاص طور پر در خور اعتنا ہیں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ دنیا میں معاشی توازن کے بگاڑ سے کیا کیا قیامت خیز مسائل پیدا ہو رہے ہیں؟

قوم کے خلفشار کا تیسرا سبب عوام کی موجودہ معاشی حالت ہے۔ (عوام میں پڑھا لکھا طبقہ بھی شامل ہے اور ان پڑھ بھی) اگر آپ غور سے دیکھیں تو بیکار لیڈروں اور بیکار مولوی صاحبان کی طرف سے جو خلفشار پیدا ہو رہا ہے اس کا بڑا سبب بھی قوم کی موجودہ معاشی حالت ہے۔ لہٰذا یہ سبب بڑا اہم ہے اور خاص توجہ کا محتاج۔

آپ زندگی کے حقائق سے شاعری کرتے رہیں تو اور بات ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ انسانی معاشرہ میں روٹی کا مسئلہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ انسانی زندگی میں ایسے مواقع کبھی کبھار آتے ہیں کہ انسان کسی بلند مقصد کے لئے اپنی جان دیدے، ورنہ انسان کی ساری زندگی جان بچانے کی فکر میں ہی گھل جاتی ہے، اور جان روٹی کے ذریعہ سے بچتی ہے۔ کمیونزم اسی لئے ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے کہ وہ روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کر دیتی ہے۔ جو انسان روٹی کی مشکل میں مبتلا ہو وہ اعلیٰ اقدار کی اہمیتوں کے متعلق وعظ سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس کی سنتا ہے جو اسے یہ بتلائے کہ اس کی معاشی مشکلات کا حل کیا ہے۔ پاکستان کا عام طبقہ جن معاشی مشکلات میں گھرا ہوا ہے وہ سب پر روشن ہے۔ یہ فضا کمیونزم کے لئے بڑی سازگار ہے۔ کمیونسٹ ان سے

کہتا ہے کہ ایک تمہارا موجودہ نظام ہے جس میں تمہاری یہ حالت ہے کہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ رہنے کو مکان ہے نہ بال بچوں کے لئے کوئی آسرا۔ یہ پھوس اور ٹاٹ کی جھونپڑیاں جنہیں ہوا کا ہر تیز جھونکا اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتا ہے اور بارش کا ہر حملہ انھیں نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یہ سوکھی روٹی جو تمہیں ہزار مشقتوں کے بعد بھی مشکل نصیب ہوتی ہے، یہ پھٹے پرانے چیتھڑے جو سردی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ تمہاری بہو بیٹیوں کا ستر ڈھانپ سکتے ہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جن کے اندر تم کیڑوں کی طرح رینگتے ہو، یہ سب اس نظام کی لعنتیں ہیں۔ انھیں دیکھو اور ان کے مقابلہ میں ان جگمگاتے محلات کو دیکھو اور ان میں رہنے والے عیش پرستوں کو دیکھو تم بھی تو انہی جیسے انسان ہو۔ تم میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ تم سے یہ کہدیا جاتا ہے کہ یہ سب خدا کی دین ہے۔ یہ تقدیر کا معاملہ ہے جس پر کسی کو کچھ بس نہیں۔ رزق صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن سوچو کہ انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو تمہاری طرح ہندوستان سے لٹ لٹا کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے بڑی بڑی فیکٹریاں، ملز، دکانیں، مکانات الاٹ کرا لئے اور وہ آج عیش کر رہے ہیں۔ تم محنت مزدوری تلاش کرتے رہو اور تمہارا یہ حال ہے۔ اور تمہیں یہ کہدیا جاتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ یہ لوگ تمہیں دھوکا دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عیش پرستیوں اور ہوس رانیوں کی خاطر خدا اور مذہب کا نام وضع کر رکھا ہے۔ یہ خود تو تمہاری کمائی پر اس دنیا میں جنت کے مزے لوٹتے ہیں اور تمہیں کہدیتے ہیں کہ تمہارے لئے خدا نے آخرت میں جنت رکھ چھوڑی ہے۔ وہ جنت غریبوں کیلئے ہے، جو یہاں مفلس و نادار، غریب اور فاقہ کش ہوگا وہی خدا کے ہاں مقبول ہوگا۔ جنت اسی کو ملے گی۔ یہ ہے جو کچھ تمہارے ساتھ خدا اور مذہب کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف ہمارا نظام ہے جو یہ کہتا ہے کہ دنیا سے امیر اور غریب کا فرق مٹا دینا چاہئے۔ کوئی شخص غریب نہ رہے۔ کوئی بھوکا نہ رہے۔ سب کو ایک جیسا رزق ملے۔ ہر ایک کیلئے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، فرنیچر، دیگر ضروریاتِ زندگی یکساں طور پر مہیا کی جائیں۔ ہر بیماری کا علاج ہو۔ ہر بچہ کی نگہداشت اور تعلیم ہو۔ سب کی صحت کا خیال رکھا جائے۔ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ لیکن اس نظام سے چونکہ ان امیروں کی عیاشیاں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے یہ اسے رائج نہیں ہونے دیتے۔ جب تم ان سے پوچھو گے کہ ایسا نظام کیوں نہیں رائج کیا جاتا تو اس کے جواب میں یہ لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ ایسا کرنے سے ہماری عیش پرستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ کہیں گے کہ کیونکہ یہ نظام اسلام کے خلاف ہے۔ خدا اور رسول کے خلاف ہے۔ مذہب کے خلاف ہے۔ اس سے تمہاری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ اس لئے ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔

ملک کا بیکار اور مفلوک الحال طبقہ کان دھر کر ان کی بات سنتا ہے اس لئے کہ یہ انھیں نفسیاتی طور پر اپیل کرتے ہیں۔ وہ ان کی مشکلات کو سمجھتے ہیں اور ان کا حل پیش کرتے ہیں۔ وہ بھوکے کو بتاتے ہیں کہ تمہیں روٹی کس طرح مل سکتی ہے اور ہر بھوکا اس بات کو کان لگا کر سنتا ہے جس کا تعلق روٹی سے ہو۔

لیکن ہم اس خطرہ کا علاج کیا سوچتے ہیں؟ وہی "وعدۂ حور"! ہم ان سے جا کر کہتے ہیں کہ ان بہکانے والوں کی باتوں میں

مت آؤ۔ یہ تمہیں خدا سے دور لے جائیں گے۔ یہ تمہیں مذہب سے برگشتہ کر دیں گے۔ کمیونزم خدا کا انکار سکھاتی ہے۔ اس میں مذہب باقی نہیں رہتا۔ اسلام کمیونزم کے خلاف ہے۔ اس لئے دیکھنا ان کے فریب میں نہ آجانا۔ ہم یہ کہتے ہیں اور مطمئن ہو کر گھر لوٹ آتے ہیں کہ ہم نے کمیونزم کی مدافعت کر دی، کتنا بڑا ہے یہ فریب جو ہم اپنے آپ کو دے لیتے ہیں۔ بھوکے کے سامنے سوال تھا روٹی کا۔

کمیونسٹ اسے روٹی دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ امیر لوگوں نے تم سے روٹی چھیننے کے لئے خدا کے نام کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

ہم جاتے ہیں تو بھوکے سے روٹی کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ کہتے ہیں تو یہ کہ کمیونزم اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے تم اسلام کو بچاؤ، خدا پر ایمان رکھو۔ مذہب بہت بڑی چیز ہے۔

جب تک اس بھوکے پر خدا اور مذہب کے احترام کا وہ اثر غالب رہتا ہے جو وراثت اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے ماتحت اس کے دل میں شعوری طور پر موجود ہوتا ہے، یہ خدا سے ڈرتا رہتا ہے۔ لیکن جب اس پر بھوک غالب آجاتی ہے تو پھر یہ اس کی سنتا ہے جو روٹی کے مسئلہ کا حل بتاتا ہے۔ اسوقت مذہب کے تمام اثرات اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ نہیں! بلکہ یہ مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی تمام مصائب اور مشکلات کا ذمہ دار مذہب ہے۔ اسی طرح کمیونزم رفتہ رفتہ آگے بڑھتی جاتی ہے اور مذہب پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ آپ کسی تعلیم یافتہ نوجوان سے بات کر کے دیکھئے وہ اس قسم کے سوالات کرے گا۔

نوجوان۔ کیا دنیا میں سب کچھ خدا کی مرضی کے ماتحت ہوتا ہے!

مذہب پرست۔ خدا قادر مطلق ہے۔ اس کی مشیت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

نوجوان۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ۹۹ فی صدی آبادی پر غربت اور افلاس کی تباہ کاریاں، بھوک، بیماریاں، وبائیں، بربادیاں، ہر طرح کی مصیبتیں، پریشانیاں۔ سب خدا کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ اس کے خلاف ایک فیصدی طبقہ میں دولت کی اسقدر فراوانی، سامان عیش و عشرت کی کثرت۔ پھر اس دولت کے نشہ سے پیدا ہونے والی بدمستیوں میں ہر قسم کی سیاہ کاریاں، ظلم، استبداد، بدمعاشی، ہوس رانی، سب خدا کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اگر یہی خدا ہے تو اس خدا کو دور سے سلام۔ جو خدا پہلے انسانوں کو ان کی مرضی معلوم کئے بغیر، از خود دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ پھر ان کروڑوں انسانوں کو فاقوں سے مارتا ہے۔ بیماریوں میں جکڑتا ہے۔ اور ان کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کا تماشا دیکھتا ہے۔ یہ خدا تمہیں مبارک۔ اور پھر جو مذہب یہ سکھاتا ہے کہ سب تعریفیں اس قسم کے خدا کے لئے ہیں۔ اس مذہب کو سات سلام۔

آج ہر نوجوان کا سینہ انہی خیالات کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو ابھی ان خیالات کو زبان پر لانے سے گھبراتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو علانیہ ان کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن محسوس ہر ایک یہی کر رہا ہے۔ مولوی کے پاس اس کا علاج کفر کا فتویٰ ہے۔ مسٹر کے پاس

اس کا مداوا، کمیونزم کا طعن ہے۔ لیکن یہ چیز نہ تکفیر و تفسیق سے جا سکتی ہے نہ طعن و تشنیع سے۔ نہ "اعلیٰ مقاصد حیات" کا وعظ کہنے سے، نہ "اسلام خطرے میں ہے" کی گھنٹیاں بجانے سے۔ اصل سوال ہے روٹی کا۔ جب تک روٹی کے سوال نے ایسی شدت اختیار نہیں کی تھی، مذہب کو خالی جذبات کے بندھنوں سے بندھا رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اب اس مسئلہ کی شدت کے سیلاب کے سامنے یہ کمزور بندھن ٹھہر نہیں سکتے۔ اب جو چیز روٹی کے مسئلہ کا حل نہیں پیش کر سکتی وہ باقی نہیں رہ سکتی، خواہ وہ کوئی دنیاوی نظام ہو یا مذہبی ادارہ۔ محض یہ رٹ لگاتے رہنا کہ کمیونزم، مادیت (Materialism) سکھاتی ہے اور مادیت (Materialism) اسلام کے خلاف ہے، اس سیلاب کو روک نہیں سکتا۔ اس سیلاب کے سامنے دنیا کے تمام نظام بھی خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے اور تمام مذاہب بھی۔ اس کا مقابلہ اور صحیح علاج اسلام کا دینی نظام کر سکے گا۔ اس دینی نظام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہی دنیا کے ہر انسان کی روٹی کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔ وہ ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کا کفیل بنتا ہے۔ وہ "سب تعریفیں" اس خدا کے لئے قرار دیتا ہے جس کی اولیں صفت "رب العالمین" یعنی تمام انسانوں کے سامانِ نشوونما کی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنے ضابطۂ آئین کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کرتا ہے (الحمد للہ رب العالمین)۔ وہ سب سے پہلے "روٹی کے مسئلہ کا حل" پیش کرتا ہے۔ جب انسان کا پیٹ بھر جاتا ہے، تو وہ پھر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا تمہارے تمام فطری تقاضے پورے ہو گئے؟ کیا یہ تقاضے محض طبعی ضروریات تک ہی محدود تھے؟ اس مقام پر قرآن کے اندازِ استدلال کے مطابق یہ حقیقت سامنے آنی شروع ہو جاتی ہے کہ نہیں، طبعی ضروریات سے انسانیت کے سب تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ انسانیت ہنوز تشنۂ تکمیل رہتی ہے۔ اس مقام پر وہ کہتا ہے کہ لو۔ اب ان تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی لو۔ کمیونزم روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتی تھی، اسلام نے بھی یہ حل پیش کر دیا۔ یہاں تک اسلام، کمیونزم کے ساتھ چلا۔ اس کے بعد کمیونزم کی آخری حد آ گئی، لیکن اسلام آگے بڑھ گیا۔ اس نے انسان کی طبعی نشوونما کے بعد اس کی انسانیت کی نشوونما کے سامان دینے شروع کر دیئے۔ لہٰذا اسلام نام ہے

کمیونزم کا معاشی حل + کچھ اور

[آتنا فی الدنیا حسنۃ] + [وفی الآخرۃ حسنۃ]

یہ اسلام، قرآن کے اندر ہے (اسی کا نام الدین ہے) لیکن جو مذہب آج کل ہمارے ہاں رائج ہے اس کے پیکنگ پر تو قرآن کا لیبل ہے، لیکن اس کے اندر خالصتہً وہ نظامِ زندگی ہے جو مسلمانوں کے دورِ شاہنشاہیت کی پیداوار ہے۔ ہمارا "اسلام" فقہ اور روایات تک جا کر رک جاتا ہے اور فقہ اور روایات ہی مسلمانوں کے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہیں۔ قرآن کے انقلابی دور میں نہ یہ فقہ تھی نہ روایات۔ یہ مذہب، جہالت کے جذباتی اثرات کے زور پر تو چل سکتا تھا لیکن زندگی کے ٹھوس حقائق کا مقابلہ کر سکنے کے قابل نہیں تھا۔ ہمارے زمانہ میں اسے زندگی کے حقائق کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس لئے یہ ان حقائق کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ ہماری ہزار مقدس

آندھیوں اور معصوم تمناؤں میں بھی اس کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ اس میں زندگی کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ تو گھن کھائی ہوئی لکڑی ہے جو اس وقت تک کھڑی رہتی ہے جب تک اُسے کوئی چھوئے نہیں۔ جونہی کسی نے انگلی لگائی، وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر نیچے آگری۔ ہمارا مروجہ مذہب، حقائقِ زمانہ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ہم اس تصور سے روتے ہیں اور اسے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم اسے "خدا کا سچا دین" سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ "خدا کا سچا دین" ہے ہی نہیں۔ خدا کے سچے دین کو زمانہ کے حقائق سے گھبرانے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ وہ تو حقائق کا مقابلہ خندہ جبینی سے کرتا ہے۔ جو دورِ ملوکیت کے پیدا کردہ نظام نے خدا کے سچے دین کی جگہ لے رکھی ہے۔ اس لئے اگر یہ باطل نظام، زمانہ کے تھپیڑوں کے ہاتھوں گر رہا ہے تو ہمیں اس پر خوش ہونا چاہئے کہ جو کام ہمارے ہاتھوں سے نہ ہو سکا، اسے دستبردِ زمانہ نے کر دیا۔ یہ غلط نظام اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا تو خدا کا صحیح دین اُبھر آئے گا۔ جب کسی درخت پر آکاس بیل چھا جائے تو وہ درخت دن بدن سوکھتا چلا جاتا ہے اور آکاس بیل سرسبز و شاداب ہوتی رہتی ہے۔ درخت کو از سرِ نو تر و تازہ کرنے کا طریق یہی ہے کہ اس سے آکاس بیل کو الگ کر دیا جائے۔ اس لئے اس آکاس بیل کی علیحدگی درخت کی قطع و برید نہیں ہے بلکہ اس کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے قائداعظم مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ

> اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اسلام کے آئینی اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس کی اصل پاکیزہ صورت کی طرف لے جا رہے ہیں۔

یاد رکھئے۔ اسلام خود ایک سوشلسٹ نظام تھا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ یہ انقلاب ہر قسم کے مالکانہ مفاد (Vested interests) کی جڑ کاٹ دیتا تھا۔ جب یہ مفادات (Vested interests) معاشرہ پر دوبارہ غالب آگئے تو انھوں نے اسلام کے سوشلسٹ نظام کو پیچھے دھکیل دیا اور اس کی جگہ مالکانہ نظام کو مسلط کر دیا جس کی رو سے رزق کے سرچشمے چند افراد کے قبضے میں دیدیئے گئے۔ باقی رہے افراد تو ان کی تسکین کے لئے "روحانیت" کا ایک غلط تصور وضع کر دیا گیا۔ ہمارا موجودہ مذہب، اسی مالکانہ نظام اور روحانیت کے غلط مفہوم کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

> روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے
> . . . . جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے
> باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

اس لئے یہ مذہب جو مجموعہ ہے مالکانہ مفاد پرستی غلط روحانیت کا، جتنی جلدی ختم ہوجائے اسلام کے لئے اتنا ہی اچھا ہے کہ اس کی موت اسلام کی زندگی کا موجب ہے، جس طرح اکاس بیل کی تباہی، درخت کی شادابی کا باعث ہوتی ہے۔ اندریں حالات ہمارے معاشرہ کے اس مہیب خلفشار کا حل، دین کے نظام کے نفاذ میں ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور مذہب کو دین سمجھتے ہوئے اس کی مدافعت کی فکر میں کمیونزم کی مخالفت کرتے رہے تو کمیونزم کسی طرح سے رک نہیں سکے گی۔ "اسلام خطرے میں ہے" کہکر کمیونزم کو روکنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے ہندوستان میں آج کل ہو رہا ہے۔ وہاں کی خبر ہے کہ

> بنارسی شیام پوجا سمیلن نے یہ انتظام کیا ہے کہ ایک ہفتہ بھر کے لئے کالی دیوی کی پوجا کا خاص پروگرام مرتب کیا جائے جس میں اس دیوی سے پرارتھنا کی جائے کہ وہ کمیونزم کے خطرہ سے بھارت کو محفوظ رکھے۔ (ڈان بلیو ۲۰)

"مذہب" ہر جگہ یہی کرے گا۔ لیکن کمیونزم کا علاج دین کی رو سے ہوسکے گا جو انسانوں کو وہ سب کچھ بھی دے گا جو کمیونزم کا معاشی نظام دیتا ہے اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ بھی دے گا۔ اگر پاکستان نے دین کا نظام اپنے ہاں نافذ کرلیا تو نہ صرف یہ کہ اس سے پاکستان ہی کمیونزم کے فلسفۂ دہریت سے محفوظ رہ جائے گا بلکہ ساری دنیا اس نظام کو قبول کرلے گی اور انسانیت اس راہ پر چل نکلے گی جو راہ اسلام نے اس کیلئے تجویز کی تھی۔

طلوعِ اسلام کا یہ پرچہ

سنہ ۱۹۵۰ء کا آخری پرچہ ہے۔ اس پرچہ کے ساتھ بہت سے حضرات کا چندہ ختم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا آپ دیکھئے کہ آیا آپ کا چندہ اس ماہ کے ساتھ ختم ہوگیا ہے یا نہیں۔ اگر ختم ہوگیا ہو اور آپ طلوعِ اسلام سے بدستور سابق وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو ازرہِ کرم اولین فرصت میں آئندہ سال کا چندہ (چھ روپے) ارسال فرما دیجئے تاکہ جنوری سنہ ۱۹۵۱ء سے آپکے نام پرچہ جاری رہے اور بند نہ کردیا جائے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

حقائق وعبر

دیدۂ عبرت کشا! پچھلے مہینے کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ چین کی فوجیں آگے بڑھیں اور انھوں نے اپنی منشا کے مطابق نہایت آسانی سے تبت پر قبضہ کرلیا۔ اس واقعہ کے مختلف گوشے ہیں اور ہر گوشہ اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جس نقطۂ نگاہ سے اس واقعہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ ہمارے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

تبت کا ملک دنیا میں سب سے زیادہ مذہب پرست ملک ہے۔ آپ عالم تصور میں دیکھئے تو پورے کا پورا ملک ایک معبد نظر آئے گا جس میں ہر وقت پوجا پاٹ کے سامان تیار ہو رہے ہیں بھگتی کی رسومات ادا ہوتی ہیں۔ کوئی گیان دھیان کی سمادھی رچائے اس گوشہ میں بیٹھا ہے کوئی اپنی جگہ پر ٹکٹکی لگائے اپنے تصورات کی دنیا میں مستغرق اس کونے میں بیٹھا ہے۔ مذہب کے مبلغ بھکشو تقدس اور احترام کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے آہستہ آہستہ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلتے دکھائی دیتے ہیں اور ان سب کے اوپر ایک لامہ ہے جسے فوق البشر صفات کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ انھیں اپنی آتما شکتی (روحانی قوت) پر بڑا ناز ہے۔ وہ ساری دنیا کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ تمہاری نجات و سعادت اسی گیان دھیان کی دنیا میں ہے۔ اس مادی دنیا کو چھوڑو۔ اپنی توجہات روحانی قوتوں پر مرتکز کرو، خارجی دنیا سے آنکھیں بند کرو اور ہمیشہ اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتے رہو۔ اسی شکتی سے تم ساری دنیا کو فتح کر لوگے۔ کوئی قوت اس قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے دعوے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ اسے اپنا سچا دھرم سمجھتے تھے کہ اتنے میں مادہ پرست چین کی فوجیں آتما شکتی کے اس قلعہ کی طرف بڑھیں۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اہل تبت کی روحانی قوتیں ان کیلئے حصار عافیت بن جاتیں۔ وہ اپنے اطمینان میں بیٹھے مذہبی رسومات ادا کرتے رہتے اور مادیت کا یہ لشکر ایک قدم آگے نہ بڑھنے پاتا۔ لیکن دنیا نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے برعکس تھا۔ ابھی چین کی فوجیں تبت سے دور ہی تھیں کہ روحانی قوتوں کے یہ تمام مستحکم قلعے خود بخود گرنے شروع ہو گئے۔ تمام معابد میں ہلچل مچ گئی۔ خانقاہوں کے پرسکون زاویوں میں کھلبلی پڑگئی۔ نہ کسی کو اپنی مرگ چھالا (مصلےٰ) کا دھیان رہا۔ نہ مالا (تسبیح) کا خیال۔ سب کے سب اس حصار عافیت سے اس طرح بھاگ نکلے جیسے آندھی کے سامنے خس و خاشاک، اور ان بھاگنے والوں میں سب سے آگے وہ تھا جو فوق البشر قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا۔

غور کیجئے کہ مادی قوت کے ایک سیلاب نے اس آتما شکتی کا طلسم کس طرح توڑ دیا!

دنیا کے مختلف مذہب پرست طبقے جب اس واقعہ پر غور کریںگے تو وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر جھوٹا اطمینان دے لیں گے کہ تبت کے بدھوں کا مذہب باطل تھا اسلئے ان کا یہ حشر ہوا۔ لیکن یہ صرف خود فریبی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس قسم کی روحانیت کے قلعے کہیں اور کسی وقت بھی مادی سیلاب کی تاب مقاومت نہیں لا سکے۔ جب تک مادی قوتوں نے ان قلعوں کی حفاظت میں اپنا معاد

دیکھا یہ قلعے قائم رہے اور جب ان کی مصلحت کوشی اس کے خلاف ہوئی تو یہ قلعے تارِ عنکبوت کی طرح اڑ گئے۔ ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت۔ اس میں اس مذہب اور اُس مذہب کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ نفس مذہب کی کمزوری ہے جو ہر جگہ مشترک ہوتی ہے۔ مذہب کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ یہ دنیا ہیچ ہے، اس سے نفرت کرو۔ مادہ ابلیس کا مظہر ہے، اس سے دور بھاگو۔ خارجی دنیا مایا ہے، فریب ہے، سراب ہے، اس سے آنکھیں بند کر لو۔ حقیقی دنیا تمہارے اندر کی دنیا ہے۔ اپنی توجہات اسی داخلی دنیا پر مرکوز رکھو۔ دنیا کو چھوڑو، اپنی نجات کی فکر کرو اور یہ نجات دنیاوی آلائشوں سے پاکیزگی کے بغیر کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے مذہب کی تعلیم جو ہر مذہب میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے۔

اسلام مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کیلئے آیا تھا۔ اس نے آکر کہا کہ مقصودِ فطرت انسانی مادی قوتوں سے بھاگنا نہیں بلکہ ان کو مسخر کرنا ہے۔ قوائے فطرت کے سامنے جھکنا نہیں، ان کو اپنے سامنے جھکانا ہے۔ یہاں تک یہ تعلیم مادیت کی تعلیم نظر آتی ہے، لیکن یہ اس کی تعلیم کا آدھا حصہ ہے۔ اس کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مادے کی ان تمام قوتوں کو مسخر کر کے انھیں خدا کے قانون کے مطابق صرف کیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کو ان کی طبعی ضروریات اور انسانی صلاحیتوں کے نشوونما کے پورے پورے مواقع میسر آجائیں اس نے کہا کہ جو لوگ قوائے فطرت کو اپنی منشا کے مطابق صرف کرنا چاہتے ہیں وہ تمہاری اس روشِ زندگی کی مخالفت کریں گے۔ ان کی مخالفت کا سر کچلنے کیلئے اپنے پاس اتنی قوت رکھو کہ وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔ تمہاری یہ قوت دنیا میں فساد پھیلانے کیلئے نہیں ہوگی، فسادی قوتوں کے استیصال کیلئے ہوگی۔ اس نظام عدل و احسان میں تمہارے شرف انسانیت کی بالیدگی ہوگی۔ جتنا تم اپنے آپ کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ کرتے چلے جاؤ گے، اسی قدر تم اپنی اصل سے قریب ہوتے چلے جاؤ گے اس لئے کہ تمہاری اصل اور ان قوانین کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اسی کا نام تزکیہ نفس یعنی شرف انسانیت کی نشوونما ہے۔ اس پورے نظام کا نام الدین ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

۱) مذہب مادی قوتوں سے گریز اور فرار کی تعلیم دیتا ہے۔

۲) خالص دنیاوی نظام مادی قوتوں کو اپنی منشا کے مطابق صرف کرنے کی تعلیم دیتے ہیں جس سے یہ دنیا انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ بن جاتی ہے۔

اور ۳) الدین، مادی قوتوں کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

"مذہب" کی زندگی مادی قوتوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ وہ ایک ثانیہ کیلئے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دنیاوی نظام ایک دوسرے کی سرپھٹول سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ وکذالک نولی بعض الظالمین بعضاً بما کانوا یکسبون۔ (۶/۱۲۹)

لیکن خدا کا دین اپنی محکم بنیادوں پر خود قائم ہوتا ہے اور نوعِ انسانی کے قیام کا ذریعہ بنتا ہے۔

مذہب کے غلط تصورات دنیا سے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ مادی قوتیں باہمی تصادم اور تزاحم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہیں۔ اب اس کے

بعد وہ دور آئیگا جب دنیا کا نظام الدین کے تابع ہوگا۔ اسوقت* زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی! دیکھیں الدین کے تمکن کی سعادت کس قوم کے حصے میں لکھی ہے کہ وہی قوم نوع انسانی کی امامت کی سزاوار ہوگی۔

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ خدا ایک ہے، رسول ایک، آئین ایک، ملت ایک۔ ان میں سے کسی ایک کو دو کر دینا شرک ہے، ایک سے دو خدا ماننا شرک، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لانا شرک فی النبوت۔ قرآن کے علاوہ کسی اور آئین کو زندگی کا ضابطہ سمجھنا شرک فی الکتاب اور ملت میں تفرقہ قرآن کی نص صریح کے مطابق شرک۔ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون (مسلمانو دیکھنا کہیں توحید کے بعد شرک نہ اختیار کر لینا یعنی وحدت نظام کی جگہ پارٹی بازی نہ شروع کر دینا جس کے بعد کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر پارٹی اپنے آپکو برسرِ حق اور دوسروں کو گمراہ کہنا شروع کر دیتی ہے۔)

اسلامی نظام کی وحدت مذہبی فرقہ پرستیوں کے باعث تباہ ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر مذہبی فرقہ پرستیوں کے پیچھے سیاست ہی کارفرما تھی لیکن بہرحال انھوں نے اپنے آپ کو مذہبی فرقوں ہی سے متعارف کرایا۔ ہمارے زمانہ میں شرک فی النبوت کی بنا پر احمدیوں کا فرقہ وجود میں آیا اور ان کے بعد سیاسی محرکات کے تابع مذہبی تعارف لئے ہوئے اسلامی جماعت کی پارٹی۔ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی ہے کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

لیکن یہ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خالص سیاسی پارٹیاں بھی کفر اور اسلام کا مدار قرار پا رہی ہیں۔ مسلم لیگ ایک سیاسی پارٹی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اب دوسری سیاسی پارٹیاں کھڑی ہو رہی ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ کس طرح سیاسی تعصب بڑھتے بڑھتے مذہبی تشدد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اخبار ڈان (مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۰) میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق محترم لیاقت علی خاں صاحب نے تاج آرٹ پریس کے افتتاح کے موقعہ پر اپنی تقریر میں فرمایا کہ

اگر کوئی مسلمان مسلم لیگ کو چھوڑتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر صداقت کی تلاش میں کسی اور طرف جاتا ہے۔

یہ خبر کسی تبصرے کی محتاج نہیں!

انتخابی مہمات

پنجاب میں جوں جوں انتخابات کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے انتخابی اکھاڑے میں شریک ہونے والی پارٹیاں اپنی اپنی کوششوں میں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ہر پارٹی اپنی خدمات جلیلہ کے منشور اس طرح ووٹروں کے حضور پیش کر رہی ہے جیسے انگریزوں کے زمانے میں گاؤں کے سفید پوش ڈپٹی کمشنروں کے سرٹیفکیٹ یا بعض اوقات اپنی بھیجی ہوئی چٹھیوں کی رسیدیں فریم کرا کر لئے پھرا کرتے تھے اس تیز خرامی میں اسلامی جماعت بھی کسی سے پیچھے نہیں، ان کے من میں ایک چور ہے۔ انھیں یہ کھٹکا ہے کہ لوگ یہ اعتراض کرینگے کہ تم ساری عمر پاکستان کی مخالفت کرتے رہے تقسیم ہند تک اس تجویز میں کیڑے ڈالتے رہے اور آج تم پاکستان کے سب سے بڑے حامی بن کر پاکستان کے نام پر

ووٹ مانگتے ہو تمہیں پاکستان کے نام پر ووٹ لینے کا کیا حق ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ یہ اعتراض پیدا ہوگا، اسلئے انھوں نے ابھی سے اسکی پیش بندی شروع کردی ہے اور اپنی تحریروں میں ظاہر کرنا شروع کردیا ہے کہ اسلامی جماعت شروع سے پاکستان کی حامی رہی بلکہ یہ تو اس باب میں مسٹر جناح سے بھی ایک قدم آگے تھی۔ مثلاً ترجمان القرآن بابت ماہ اکتوبر کے اشارات میں تحریر فرماتے ہیں،

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کیلئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود برقرار رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کیلئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہوجائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

مودودی صاحب نے یہاں یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی پاکستان کے قیام کی حمایت کرتے تھے۔

ترجمان القرآن نومبر کی اشاعت کے اشارات میں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے گا اس میں کوئی آئینی تحفظات ان کے کام نہیں آسکتا مگر اب اس پیچیدگی کا حل کیا۔ یہ سوال سخت پریشان کن تھا۔ ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ تقسیم ملک کا مطالبہ پیش کیا جائے اور ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کرالیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن بہت سے لوگوں کو جن میں ابتداءً خود مسٹر جناح مرحوم بھی شامل تھے، اس حل کو قبول کرنے میں اس بنا پر تامل تھا کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلہ کو حل کرتا ہے بقیہ آدھی جو ہندوستان کے بڑے حصہ میں کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے بالکل اکثریت کے رحم پر چھوٹ جاتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ اسلامی جماعت نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر "مسلمان" قومی مفاد کی بجائے اپنے اصول اور اپنے نظریہ حیات کیلئے جدوجہد شروع کردیں" تو چند سالی کے اندر پورا ہندوستان دارالسلام بن جائیگا۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اس نظریہ نے قوم کی اکثریت کو اپیل نہ کیا اور "مسلمانوں نے بہ حیثیت ایک قوم کے پاکستان کے نظریہ کو اپنا مطمح نظر بنا لیا"

اب آگے دیکھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس تنظیم سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اسی وقت سے ایک ایسے منظم اور تربیت یافتہ گروہ کو تیار کرنا شروع کردیا جائے جو برعظیم میں اسلام کے غلبہ کیلئے کام کرنے کے قابل ہو۔ اگر خدانخواستہ مسلمان تقسیم ملک کی جدوجہد میں ناکام ہوجائیں تو یہ گروہ اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کیلئے موجود رہے اور اگر ملک تقسیم ہوجائے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یہ گروہ اسلام کا علم بلند کرنے کیلئے تیار رہے۔

مودودی صاحب ایک بڑے ہشیار جرنلسٹ ہیں، اور دور حاضرہ میں جرنلزم کی خوبی یہ ہے کہ بات کبھی صاف صاف نہ کی جائے۔

ایسا تطبیعی پہلو اختیار کیا جائے کہ قارئین کو شعوری طور پر اپنا ہم نوا بنا لیا جائے۔ مودودی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی مخالفت کرتی رہی اور پاکستان کے حامیوں کو گالیاں دیتی رہی۔ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ پاکستان کے حامی تو صرف حصول پاکستان کی فکر کر رہے تھے اور ہماری جماعت اس معاملہ میں ان سے بھی دو قدم آگے تھی۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بن سکا تو مسلمانوں کو کیسے بچایا جائیگا اور اگر پاکستان بن گیا تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کی حفاظت کا انتظام کس طرح کیا جائیگا۔ غور کیجئے انھوں نے کس طرح اپنے آپ کو نہ صرف پاکستان کا حامی ہی بتلا دیا بلکہ قوم کے سر پر یہ احسان عظیم رکھا ہے کہ تم اور تمہارے لیڈر صرف پاکستان بنانے کی فکر میں تھے اور ہم دونوں صورتوں کو سامنے رکھکر مسلمانوں کو بچانے کی فکر میں۔

ان لوگوں نے خوب سمجھ رکھا ہے کہ پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوا کرتا ہے اور لفظی آرائش سے انھیں بڑی آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے لیکن ہم مودودی صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے قیام کے بعد تقسیم ملک تک اپنے سارے لٹریچر سے کہیں سے بھی یہ ثابت کر دیں کہ انھوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی اور اپنی جماعت سے یہ کہا تھا کہ تم اس مقصد کے لئے تیار رہو کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بن سکا تو اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کیا جائے گا۔ وہ اپنے سارے لٹریچر سے کہیں سے یہ بات نکال دیں جہاں سے ان کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہو۔ یعنی یہ کہ انھوں نے

(۱) ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کی حمایت کی تھی۔

اور (۲) یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنا تو پھر ان کی جماعت مسلمانوں کے تحفظ کیلئے تیار ہوگی۔

مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلامی جماعت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو اسلامی جماعت "ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اسلام کا علم بلند کرنے کیلئے تیار رہے گی"۔ کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اسلامی جماعت ہندوستان میں اسلام کا علم بلند کرنے کیلئے کیا کر رہی ہے۔

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے انہی اشارات میں فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا آغاز ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اس ابتدائی منزل کی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے حالانکہ یہ واقعہ ہے (جس کا انھوں نے خود بھی ذکر کیا ہے) کہ اسلامی جماعت کی بنیاد ہی ۱۹۴۱ء میں ڈالی گئی تھی۔ غالباً اپنی بنیاد سے پہلے یہ جماعت "عالم امر" میں تھی۔

وزارتوں کی کرسیاں تو واقعی بڑی چمکیلی ہوتی ہیں لیکن ان کے حصول کیلئے انسان کو جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ بھی کچھ کم جگر خراش نہیں ہوتے اور یہ جگر خراشی اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب کوئی شخص کھلے بندوں سامنے آنے کی بجائے اس میدان میں مذہب کے سائے میں اس طرح دبے پاؤں آگے بڑھے

چوں زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید!

اسلاف کی عظمت

تاریخ اور اسلاف کے بارے میں طلوع اسلام کا مسلک قارئین طلوع اسلام کے سامنے ہے۔ بزرگانِ امت میں سے جب کسی کے متعلق تاریخ کوئی ایسی بات کہتی ہے جو ان کے شایانِ شان نہ ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تاریخ کی غلطی ہے۔ ان بزرگوں کا مقام اس سے بلند تھا کہ وہ دیدہ دانستہ اس قسم کی بات کرتے۔ لیکن مولوی صاحبان ہیں یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کے متعلق جو کچھ تاریخ میں مذکور ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے۔ اب اگر تمہیں ان کے کسی عمل اور قرآن کے کسی حکم میں تضاد نظر آتا ہے تو تم یوں سمجھو کہ تم نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا۔ قرآن کا صحیح منشا یہی تھا جو ان بزرگوں کے عمل سے ظاہر ہے۔ تمہیں اپنے فہم قرآن کو ان بزرگوں کے اعمال کے مطابق بدلنا ہوگا۔ کیونکہ وہ تم سے زیادہ بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ لیکن اب دیکھئے کہ خود مولوی صاحبان کا اس باب میں کیا مسلک ہے۔

مودودی صاحب نے ایک اصول پیش کیا ہے کہ جو شخص کسی منصب کیلئے امیدوار ہو اسے اس منصب سے محروم کر دینا چاہئے کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق کسی منصب کیلئے اپنے آپ کو پیش کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور احادیث کے بھی۔ (جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کے متعلق ہم اسی اشاعت میں "قرآن کے مصرف" کے عنوان میں گفتگو کر چکے ہیں۔) کسی شخص نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اس مسلک کو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف قرار دیتے ہیں مگر حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے خود بطور امیدوار پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

> آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام یا بزرگان سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانون زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمان خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

یعنی مودودی صاحب کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ قرآن اور رسول اللہ صلعم کے فرمان کو صحیح نہیں سمجھے تھے۔ قرآن اور احادیث کا صحیح منشا مودودی صاحب سمجھے ہیں اور چونکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل اس منشا کے مطابق نہیں جو مودودی صاحب سمجھے ہیں اسلئے حضرت علیؓ سے اس باب میں لغزش ہوئی لہٰذا ان کا یہ عمل مودودی صاحب کیلئے حجت نہیں ہے۔ یعنی دوسروں کیلئے تو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی بزرگ کا کوئی عمل تمہارے فہم قرآن کے خلاف جائے تو اپنے فہم قرآن کو ان کے عمل کے مطابق ڈھالو کیونکہ وہ قرآن کریم کو تم سے بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن جب کسی بزرگ کا کوئی عمل مودودی صاحب کے فہم کے خلاف جائے تو مودودی صاحب کا فہم ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ان بزرگوں کے عمل کو لغزش قرار دیا جائے گا۔ دوسروں کیلئے وہ معیار اور اپنے لئے یہ معیار۔ لیکن ٹھیک ہے امارت اپنی امتیازی شان رکھتی ہے۔

حکومت کیوں توجہ کرے؟

تشکیلِ مملکت کے بعد چاروں طرف سے انفرادی اور اجتماعی طور پر مطالبات کی چیخیں اٹھیں کہ حکومت یہ کرے اور پہلے یہ کرے۔ کاش ہمیں آپ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا۔ ہم نے حکومت کے کسی تعاون کے بغیر یہ ملی مشترکہ ادارہ قائم کیا۔ ہماری دیانت اور شب و روز کی محنت اور آپ کے سرمائے سے آج یہ ادارہ "کتاب لمیٹڈ" اپنے ٹھوس کام اور ملی فرصت کے طفیل سربلند ہے۔ چار ماہ میں دو کتابیں مارکیٹ میں لے آنا مذاق نہیں تھا۔ ہم اپنے بہتر کاروبار سے خوش ہیں۔ آپ صرف ایک سو روپیہ کا ایک حصہ خرید کر مستقبل کے لئے اطمینان حاصل کریں۔ کاغذات کارڈ لکھ کر طلب فرمائیں۔

منیجر

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کیا آپ کو اِن کی ضرورت ہے؟

اقبال اور قرآن	عارف بٹالوی	۵/۱۲
اقبال کی نئی تشکیل	عزیز احمد	۶/۸
روحِ اقبال	یوسف حسین	۵/۱۲
سیرتِ اقبال		۶/۸
اشاراتِ اقبال	طارق بی اے	۳/۸
معارفِ اقبال	" "	۳/-
جہانِ اقبال	" "	۷/۸
ملفوظاتِ اقبال	محمود نظامی	۴/-
محمد بن عبدالوہاب	مسعود عالم ندوی	۳/۴
مشرقِ وسطیٰ کا معاشی جائزہ	علی بزدانی	۳/۸
پاکستان کا معاشی جائزہ	محمد بن علی	۴/۸
اندھیرا اُجالا	عابد جعفری	۳/۱۲
رودِ آنسو	عارف بٹالوی	۳/-
رودِ کوثر	محمد اکرم	۹/-
اسلام اور سود	انور اقبال	۳/۸

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کسی فرد یا جماعت کے نظریات کا براہِ راست اور تفصیلی مطالعہ کئے بغیر

اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا ناممکن ہے

مختلف دینی اور ملی مسائل میں **جماعتِ اسلامی** کا موقف اس کے لٹریچر سے معلوم کیجئے

جماعت کی بنیادی دعوت اور نصب العین

دستور جماعت اسلامی ۔ جماعتِ اسلامی کی دعوت ۔ دعوت اسلامی اور اسکے مطالبات ۔ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں ۔ شہادتِ حق ۔
-/۲/- -/۶/- -/۸/- -/۶/- -/۶/-

جماعت کی پچھلی تاریخ (۱۳۶۰ تا ۱۳۶۶)

روداد جماعت اسلامی حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ پنجم ۔ روداد مستقلہ حلقہ خواتین ۔
-/۶/- -/۱۴/- -/۶/- -/۶/- -/۱۲/-

تقسیم ہند سے قبل جماعت کا سیاسی موقف

اسلام کا نظریہ سیاسی ۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول، حصہ سوم، مسئلہ قومیت ۔
-/۸/- -/۸/- (دوسرا ایڈیشن) -/۴/۲ -/۸/۲

پاکستان کے سیاسی مسائل میں جماعت کا مسلک

مطالبۂ نظامِ اسلامی ۔ آزادی کے اسلامی تقاضے ۔ اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر
-/۲/- -/۴/- -/۱/-

اسلامی ریاست میں کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف ۔ اسلامی ریاست میں شہریت اور اس کے حقوق و فرائض
-/۱/- -/۱۳/-

اسلامی ریاست میں اطاعت کے شرائط و حدود ۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق
-/۱/- -/۱۲/-

معاشی مسائل میں جماعت کا نقطۂ نظر

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل، سود ۔ مسئلہ ملکیت زمین ۔ اشتراکیت اور نظامِ اسلام ۔ قومی ملکیت ۔
-/۸/- -/۸/۲ -/۱/-

حجیت و اہمیتِ حدیث کی بحث "**تفہیمات**" میں ملاحظہ فرمائیں ۔

جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی معلوم کرنے کیلئے "جماعتِ اسلامی کی انتخابی جدوجہد" مطالعہ فرمائیں ۔

"مسئلہ کشمیر کے بارے میں جماعت کا موقف" مولانا مودودی کی نظربندی کیوں ہے سے واضح ہوگا ۔

مکمل فہرست **مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی لاہور** سے طلب فرمائیں